طُرفَہ تماشا

مَسیح انجُم

www.taemeernews.com

طُرفہ تماشہ (طنز و مزاح) مسیح انجم

ناشر: زندہ دلانِ حیدرآباد

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب کا نام : طُرفہ تماشہ

مصنف : مسیح انجم

سنہ اشاعت : ۱۹۹۳ء

تعداد : ایک ہزار

کتابت : محمد عبدالرؤف

طباعت : ڈائرہ الکٹرک پریس

چھتہ بازار، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲ (اے.پی.)

سرورق : طالب خوندمیری

قیمت : -/40 روپے

جزوی مالی اعانت : آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی

ملنے کے پتے :

دفتر "شگوفہ" ۱۳ - بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱

حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲ (اے.پی.)

مصنف کا پتہ : C - 502،

ایم۔ جی۔ اوز کالونی، دستقل پورم حیدرآباد ۶۶۱ (اے.پی.)

www.taemeernews.com

انتساب

مقبول و ممتاز مزاح نگار

جناب نریندر لوتھر کے نام

جو

سوچتے انگریزی میں اور ہنساتے اردو میں ہیں۔

www.taemeernews.com

○ مسیح انجم عصری طنز و مزاح کے نمائندہ اور اہم ادیب ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ ان کے ہاں اُردو طنز و مزاح کے روایتی علاقے میں توسیع کا رجحان غالب ہے۔ وہ شہری مسائل کے ساتھ دیہاتی زندگی کے مضحک پہلوؤں کو طنز و مزاح کا خوبصورت روپ دیتے ہیں۔ وہ متشرع قسم کا پاک و صاف مزاح لکھتے ہیں۔ اور اِرد گرد وقوع پذیر واقعات کو مبالغے کی ہلکی آنچ میں تپا کر مزاح کی لذیذ ڈِشس تیار کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کے رگ و پے میں شگفتگی اور ظرافت کا خون اُچھلتا کودتا نظر آتا ہے۔ "طرفہ تماشہ" میں ان کا فن پورے شباب پر ہے ——

مسیح انجم نے متعدد خاکے بھی لکھے ہیں۔ ان کے خاکوں میں تصویر کا ایک رُخ پیش نہیں ہوتا بلکہ وہ شخصیت کے تمام نمایاں خدوخال اور کردار کے سارے اہم پہلوؤں کا اپنے خاص رنگ میں احاطہ کرتے ہیں۔ ممدوح سے ان کی واقفیت اور قربت خاکے میں بے تکلف فضا فراہم کرتی ہے۔

۱۵ر ڈسمبر ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
مدیر ماہنامہ "شگوفہ"

www.taemeernews.com

دو باتیں

چند فنٹاسی، چند انشائیے، چند مضامین اور چند خاکوں پر مشتمل اس مجموعہ کا نام "طرفہ تماشا" ہے، جو میرا چوتھا مجموعۂ مضامین ہے اور یہ بھی ایک تماشہ ہے کہ میری یہ کتاب پورے دس سال بعد منظر عام پر آرہی ہے۔ اس سے پہلے مزاحیہ مضامین کی میری تین کتابیں "سائڈ سے چلیے" (۱۹۷۳ء)، "درپردہ" (۱۹۷۶ء) اور "چنانچہ" (۱۹۸۳ء) میں شائع ہوئی تھیں جو اب نایاب ہیں۔ یہ میرا کام نہیں ہے کہ "طرفہ تماشا" میں شامل مضامین میں طنز و مزاح کی نشاندہی کروں۔ میں نے حتی المقدور کوشش کی کہ مضامین میں ایک خوشگوار فضا برقرار رہے تاکہ قاری جھلاہٹ سے اکتا نہ جائے۔ میں نے اس مقصد میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے یہ میں نہیں جانتا۔

کتاب کو خاطر خواہ حد تک خوبصورت بنانے میں میرے عزیز دوست اور نامور مزاحیہ شاعر طالب خوندمیری نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جس کی تلافی ان کا ایک بدصورت خاکہ لکھ کر ہی کسی حد تک کی جاسکتی ہے۔ میرے عزیز دوست ڈاکٹر مصطفیٰ کمال مدیر "شگوفہ" نے کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں مفید مشوروں سے نوازا جن کا میں بے حد ممنون ہوں۔ میری اس کتاب کی اشاعت کی فکر مجھ سے کہیں زیادہ میرے عزیز ترین دوست و جواں سال ادیب وہاب قیصر کو تھی۔ جن کی بار بار کی یاددہانی اس کتاب کی اشاعت کا سبب بنی۔

بہرحال "طرفہ تماشا" پیش خدمت ہے۔ قبول فرمائیے اور اپنی قیمتی آراء سے نوازیئے۔ کیوں کہ ایک ذہین قاری کی بے لاگ رائے ہی ایک نک چڑھے نقاد کا نعم البدل ہوتی ہے۔

پتہ: C-502,
N. G. O'S. COLONY VANASTHALI PURAM HYD. 500 661.
(A.P.) INDIA.

www.taemeernews.com

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

فن کے آئینے میں

مسیح انجم نے طنز و مزاح میں اپنا مقام بتدریج، بڑی لگن اور محنت سے بنایا ہے۔ ان کے مضامین پڑھتے ہوئے علانیہ احساس ہوگا کہ یہ شخص زندگی میں صرف تماشائی نہیں رہا، تماشا بھی بن گیا۔ ایسے فن کاروں کے ہاں عام طور پر طنز ہی نہیں زہرناکی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن مسیح انجم نے غالباً اس زہر کو پی لیا ہے۔ اور اپنے قارئین کو صرف شہد و شکر سے نوازا۔ ان کے ہاں طنز کے مقابلہ میں مزاح زیادہ ہے..... طنز و مزاح کے اس خوشگوار امتزاج نے جس میں مزاح کا پلہ گراں ہے مسیح انجم کے فن کو سنوار دیا ہے۔ عصری حسیت نے ان کے طنز و مزاح کو اور حقیقت پسندانہ اور زندگی دوست بنا دیا ہے۔ اپنے موضوعات پر مسیح انجم کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ وہ عصری مسائل کی سمت ہماری توجہ کچھ اس طرح مبذول کراتے ہیں کہ ہم نہ صرف ہنستے ہیں بلکہ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ طنز و مزاح نگار جب اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو سمجھئے اس نے اپنا مقام پالیا۔

www.taemeernews.com

لیکن مجھے یقین ہے کہ مسیح انجم ہر اک مقام سے آگے مقام ہے اپنا سمجھتے ہوئے ایک نئے مقام کی سمت گامزن ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

مسیح انجم کے ہاں طنز کم ہے۔ لیکن بعض جگہ ان کے طنز کے وار بڑے کاری اور شدید ہیں کہ ان کے معاشرتی شعور کی پختگی آئینہ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

● ...... مسیح انجم کی ایک اور خصوصیت ان کی شخصی خاکہ نگاری بھی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی طرح ان کو بھی اپنے دوستوں کے دلچسپ خاکے تیار کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ ان خاکوں میں وہ اپنے دوستوں کی خوبیوں کو کمزوریاں اور کمزوریوں کو خوبیاں بنا کر اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری نظر کے ہر وقفہ پر مسکرا مسکرا کر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ خاکہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کی لذت تا دیر دل کو خوش اور مسرور رکھتی ہے۔

www.taemeernews.com

ترتیب

شگوفہ کی عدالت میں (تعارف)	۹
شاعروں اور ادیبوں کی کالونی	۱۹
قصّہ "درس" سناتے ہیں	۲۷
دُم دار ستارہ "ہیلی" کی یاد میں	۴۲
مَردوں کی شمشیریں	۵۴
مجسّمے بولتے ہیں	۶۰
بیت الخیال	۷۵
بوریا ٹاکیز کی یاد میں	۸۰
مرض بڑھتا گیا	۹۰
داڑھی سے پہلے' داڑھی کے بعد	۹۷
املی کی مدح میں	۱۰۴
دسواں سیّارہ "جہیز یار جنگ"	۱۱۰
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا	۱۱۶
گلشن' تیغ اور کرکٹ فیور	۱۲۷
خاکے: حضرت یوسف قوسین	۱۳۷
کیا باکمال شخص ہے یہ مصطفےٰ کمال	۱۴۴
فیلڈ مارشل عاتق شاہ	۱۵۴
برق آشیانوی ـــ کچھ یادیں کچھ باتیں	۱۶۳
شاعر ایک نام تین: (رشید+سمیع+جلیل)	۱۷۰

www.taemeernews.com

'شگوفہ' کی عدالت میں

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب میں سرکاری طور پر قسمیں کھانے پر مامور تھا۔ دن بھر میں کوئی بیس پچیس بار بس یہی ایک قسم کی قسم کھاتا :

خُدا کی قسم صحیح صحیح ترجمہ کروں گا!

ہر بار قسم کھاتے وقت مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ایک نان ویجیٹیرین کے سامنے بار بار اڈلی سامبر کی ڈش پیش کی جارہی ہو۔ یہ بھی کوئی قسم ہوئی؟ نہ ندرت، نہ ورائٹی! ندرت اور ورائٹی ہو تو قسم ہی کیا، گالیاں کھانے میں بھی مزہ آجائے! جب میں قسم کھا لیتا تو اس کے فوری بعد گواہ کو بھی قسم کھلاتا کہ "کہو، خدا کی قسم جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا۔!"

اس طرح قسم کھانے اور کھلانے کا مجھے معاوضہ بھی ملتا تھا۔ مہینے کے ختم پر جب میں "معاوضہ" اور "محنت" کا موازنہ کرتا تو بہت ساری قسمیں "نفری" میں پڑتی تھیں۔ یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ مجھے میٹرک کامیاب کئے ہوئے تین، چار دن ہی ہوئے تھے کہ ایک دن تایا جان نے حکم دیا کہ جاؤ۔ عدالت جاکر میری رخصت کی درخواست دے آؤ! (والد کو تایا جان اور والدہ کو تائی ماں کہنے کا سبق مجھے بچپن ہی میں پڑھایا گیا تھا) میرے تایا جان عدالت منصفی سدی پیٹھ میں صیغہ نو عداری میں نقل دیس کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے حکم کی تعمیل میں عدالت پہنچا

www.taemeernews.com

اور ان کی درخواست پیش کردی۔ اتنے میں ایک شناسا نے یہ بتایا کہ عدالت میں COPYIST کی ایک اسامی خالی ہے، درخواست دے دو، تقرر ہو جائے گا۔

ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً درخواست دے دی۔ خدا کی دین کا حال ہم سے پوچھئے کہ دینے گئے تھے رخصت کی درخواست تایا جان کی۔ لیکن واپس لوٹے تو COPYIST (بروزن TYPIST) کا دُم چھلا ساتھ لگا ہوا تھا۔ دوسرے ہی دن نقل نویسی پر مامور ہو گئے۔ پہلے روز ہی یہ عقدہ کھلا کہ نقل نویسی میں عقل کی قطعی ضرورت نہیں۔

چند ہی دِنوں میں ہماری "تلگو دانی اور انگریزی دانی کے چرچے چہار دانگ عدالت میں پھیل گئے۔ البتہ ہماری اردو دانی کو کوئی بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ کیوں کہ وہاں کے عملے میں کئی ایک جیّد اور خرانٹ قسم کے منشی کامیاب اہلکار تھے جن کے آگے ہماری اردو دانی کا دیا جلتا نہ تھا۔ البتہ ہماری "تلگو دانی اور انگریزی دانی کا سکہ خوب چلتا تھا۔ وہ بھی محض اس لئے کہ پورے عملے میں ہم دوسرے شخص تھے جو میٹرک پاس تھے نقل نویسی پر مامور ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز عدالت کے اجلاس پر محکمہ آبکاری کی طرف سے گانجے کا مقدمہ پیش ہوا۔ فاضل مجسٹریٹ گواہوں کے بیانات کی سماعت فرما رہے تھے۔ اور مترجم صاحب گواہوں کے تلگو بیانات کا اردو ترجمہ مجسٹریٹ تک پہنچا رہے تھے۔ ایک گواہ نے اپنے بیان کے دَوران یہ بتایا کہ ملزمین نے گانجے کے درخت "بنتی چیٹلو" (گیندے کے پودے) کے درمیان بوئے تھے (چونکہ گانجے کی پتیاں گیندے کی پتیوں سے مشابہ ہوتی ہیں اس لیے غیر قانونی کاروبار کرنے والے گانجے کے پودوں کو گیندے کے پودوں کے درمیان بوتے ہیں) اب جو مترجم صاحب "بنتی چیٹلو" کے ترجمہ پر پہنچے تو بغلیں جھانکنے لگے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو

www.taemeernews.com

فوراً لفظی ترجمہ کر ڈالا۔

"گو لے کے درخت"

فاضل مجسٹریٹ جو تلگو سے ناواقف تھے، حیران کہ یہ گولے کے درخت کیا ہوتے ہیں؟ پتہ نہیں اجلاس پر مجسٹریٹ کو کس نے بتایا کہ ان کے ماتحتین میں ایک ایسا انگریزدان بھی ہے جو یہ مشکل آسان کر سکتا ہے (اس وقت تک ہماری تلگو دانی کی مجسٹریٹ کو خبر نہ تھی) چنانچہ اجلاس پر ہماری طلبی ہوئی۔ ہم حیران کہ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے؟ اور ہم سے ایسا کونسا جرم سرزد ہوا ہے کہ اجلاس پر طلبی ہوئی ہے ہم نے اپنے شرٹ کو جو پتلون سے باہر ہوا کھا رہا تھا، اچھی طرح "اِن" (IN) کیا۔ بال ٹھیک سے جمائے چہرے پر "یادِ حق" کے آثار بیم و تعش منتشا و تذلل منتشا کا ورد کرتے ہوئے تھر تھر کانپتے اور لڑکھڑاتے قدموں سے اجلاس پر حاضر ہوئے۔ اور فوراً "YOUR HONOUR" اور "MY LORD" کہتے ہوئے ادھر ادھر دو تین فرشی آداب بجا لائے۔ فاضل مجسٹریٹ نے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے پوچھا "ہاں تو جناب یہ تنتی چیٹلو کیا ہوتا ہے؟"

اس آسان لفظ پر ہمارے اوسان جو خطا ہو رہے تھے فوراً بحال ہو گئے۔ کیوں کہ ہم ان درختوں کو نہ صرف دیکھ چکے تھے بلکہ کئی بار ان درختوں میں آنکھ مچولی بھی کھیلی تھی۔ بلا جھجک ترجمہ کر دیا۔

"گیندے کے درخت"

مجسٹریٹ صاحب بہت خوش ہوئے۔ ترجمے کا المیہ ختم ہو گیا اور گواہ کی جان چھوٹی۔ اسی وقت مجسٹریٹ نے مترجم کو حکم دیا کہ جاؤ تم اپنے سکشن

www.taemeernews.com

میں کام کرو۔ ادھر خاکسار کو حکم دیا کہ کرسی پر بیٹھو اور قسم کھاؤ کہ خدا کی قسم صحیح صحیح ترجمہ کروں گا۔ پھر تو ہم مترجم کی کرسی پر براجمان ہو گئے۔

ہائے! وہ بھی کیا دن تھے جب ہم فاضل مجسٹریٹ کی سیدھی جانب کرسی پر بیٹھے مترجم کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ مہینہ بھر قسمیں ہم کھاتے اور اس کا معاوضہ تنخواہ کی شکل میں "گولے کے درخت" والے مترجم صاحب پاتے! اس وقت ہماری عمر ۱۸ / ۱۹ سال کی تھی لیکن دیکھنے میں بالکل "لونڈا" نظر آتے تھے۔ چہرے پر دُور دُور تک سبزے کا پتہ نہ تھا۔ ویسے ہمارے بالغ ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن اس کو کیا کیجیئے کہ داڑھی اور مونچھوں کو ہمارے بالغ ہونے کی اطلاع نہیں ملی تھی — ہم جب تک عدالت میں رہے، مترجم رہ کر بھی COPYIST کے COPYIST ہی رہے۔ ہمیں اس بات کا شدید ملال رہا کہ "گیندا" اور "گولہ" میں جو نازک فرق ہوتا ہے، اس کے بتانے کا معاوضہ کبھی نہ ملا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے حلقے میں پولیس کے جوانوں، جمعداروں اور سب انسپکٹروں کے سیلوٹس آئے جن کا کوئی شمار نہیں لیکن سیلوٹس سے انسانی ضروریات وخواہشات کی تکمیل تو ہو نہیں پاتی۔ بالآخر ۱۹۵۶ء میں عدالت کو خیرباد کہا اور حیدرآباد چلے آئے۔ ہمیں اگست کا مہینہ دو طرح سے عزیز ہے۔ ایک تو اس لیے کہ ہمارے ملک کو اسی مہینے میں انگریزوں سے نجات ملی۔ دوسرے اس لیے کہ ہم کو اسی مہینے میں قسمیں کھانے سے چھٹکارا حاصل ہوا۔

جہاں تک میرے دیگر احوال کا تعلق ہے، وہ خاصے دلچسپ ہیں۔ آندھرا پردیش کے نقشہ میں ایک حقیر سا نقطہ ہے، جس کا نام ہے "وِلکٹور"۔ یہی میرا پیدائشی گاؤں ہے۔ میٹرک کی سند میں تاریخ پیدائش ۶ / اکتوبر ۱۹۳۲ء لکھی ہوئی ہے۔ میرے

www.taemeernews.com

پیدا ہوتے ہی والدین نے مجھے اپنی چچی کی گود میں ڈال دیا کہ "جاؤ بیٹا! تم اپنے چچا کا گھر روشن کرو" کیوں کہ میرے چچا کے گھر میں کوئی "چراغ" نہیں تھا جو ان کا گھر روشن کرتا۔ البتہ ہمارے گھر میں بہت سے "چراغ" روشن تھے جن کی موجودگی میں میرا وجود ایک فاضل چراغ کا سا ہوگیا تھا۔ چنانچہ بچپن ہی میں مجھے یہ سبق پڑھایا گیا کہ میں والد کو تایا جان اور والدہ کو تائی ماں، اور چچا کو ابا جان اور چچی کو امی جان کہوں۔ گویا یوں سمجھ لیجئے کہ میری مزاح نگاری کا آغاز یہی ہے۔ اسی لیے بچپن میں بعض عزیز و اقارب مجھے چھیڑنے کی خاطر ازراہِ مذاق کہا کرتے "ارے یہ لونڈا! باپ کو باپ نہیں بولا۔ بڑوں کو چچا کیا بولے گا؟"

میری ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی جہاں ایک چاوڑی کو مدرسہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اور یہ مدرسہ بھی ایسا تھا جہاں نہ تو چپراسی کا انتظام تھا اور نہ فرنیچر کا۔ لڑکے خود بلا لحاظ مذہب و ملت باری باری روزانہ مدرسہ میں جھاڑو لگاتے اور اپنی نشستوں کا آپ انتظام کرلیا کرتے تھے۔ ہر لڑکا اپنی بغل میں بستہ کے ساتھ ساتھ چٹائی یا ٹاٹ دبائے اسکول کو چلا آتا۔ ہمارے استاد خود بھی بوریئے پر تشریف فرما ہوتے۔ وہ ذات کے برہمن تھے تلگو تو خیر ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ لیکن اردو پر بھی خاصا عبور تھا۔ املا نویسی کے گھنٹے میں ایسے ادق اور مشکل الفاظ لکھواتے کہ بس پھریری سی آجاتی۔ وہ ہمیں اس قسم کے الفاظ کا املا لکھواتے جن میں طلباء کے پٹنے کا خاصا اہتمام رکھا گیا ہو۔ جیسے: حتی الامکان قسطنطنیہ، استنبول وغیرہ اس قسم کے الفاظ سے جماعت دوم ہی میں پالا پڑا تھا۔

www.taemeernews.com

میں نے سیدی پیٹھ ہائی اسکول سے میٹرک کامیاب کیا۔ یہاں میں نے پریم چند کے افسانے پڑھے اور کافی متاثر ہوا۔ انہی دنوں میرے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ لیکن روزانہ مدرسے کو آٹھ میل پیدل جانے اور آنے کی مسافت اس جذبے کو کچل دیتی تھی اور پھر دوسری بات یہ کہ ادبی ماحول کا دُور دُور تک کوئی پتہ نہ تھا۔

میری عملی زندگی کا آغاز شہر حیدرآباد سے ہوتا ہے۔ یہیں میں نے محکمہ تعلیمات میں ملازمت اختیار کی۔ اور یہیں میں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے خانگی اُمیدوار کی حیثیت سے بی اے اور بی ایڈ کے امتحانات کامیاب کئے۔ یہیں میری ملاقات ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین سے ہوئی۔ اور پھر یہ ملاقات رفتہ رفتہ دوستی میں تبدیل ہوتی گئی۔ اب تو میں اپنے آپ کو ان ہی کے خاندان کا ایک فرد تصور کرتا ہوں۔ میری حوصلہ افزائی کرنے میں مجتبیٰ حسین کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ مجتبیٰ حسین جتنے اچھے مزاح نگار ہیں اس سے کہیں زیادہ سادگی پسند ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ فیصلہ کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کہ آیا مجھے ان کے مضامین زیادہ پسند ہیں یا ان کی سادگی۔

میں نے افسانے سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ میرا پہلا افسانہ ۱۹۶۶ء میں روزنامہ "ملاپ" میں شائع ہوا۔ مجھے افسانے کے فسوں سے نکال کر طنز و مزاح جیسی تیز دھار دار تلوار پر چلنے کے لیے اُکسانے والے میرے عزیز دوست مصطفیٰ کمال ہیں۔ اُنھوں نے میرا پہلا مزاحیہ مضمون روزنامہ "رہنمائے دکن" میں شائع کیا۔ (یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کہ کمال صاحب "رہنمائے دکن" کا ادبی صفحہ ترتیب دیا کرتے تھے) اس کے بعد کمال صاحب نے ماہنامہ "شگوفہ" میں میرے

www.taemeernews.com

اتنے مضامین شائع کیے کہ "شگوفہ" اور "زندہ دلانِ حیدرآباد" میری کمزوری بن گئے۔ پھر اس کے بعد انھوں نے مجھے "شگوفہ" کی مجلسِ ادارت میں شامل کر کے میری عزت بڑھائی۔

یوں تو میرا نام محمد مسیح الدین ہے۔ لیکن مسیح انجم کے نام سے مزاح نگاری کرتا ہوں۔ جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے، میں خالص طنز کو پسند نہیں کرتا۔ کیوں کہ خالص طنز گالی کے قریب پہنچتا ہے کہ رذیل کو رذیل کہنا ادب نہیں، گالی ہے۔ اور بات بڑھ کر فوجداری تک جا پہنچتی ہے۔ مزاح نگاری کے لیے اعلیٰ ظرفی اولین شرط ہے۔ اور اس شرط پر وہی مزاح نگار کھرا اُترتا ہے جس نے ساری انسانیت سے ٹوٹ کر پیار کیا ہو اور جس میں غم و آلام کو پی جانے کا حوصلہ ہو۔

میں دوستوں کی محفلوں میں مزاح کے نام پر اوچھے فقرے کسنے سے بھی بہت گھبراتا ہوں۔ اور یہ فیشن آج کل بہت عام ہے۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ جو بھی کہو بزبانِ قلم کہو، اس میں ہر دو ادیب اور قاری کی پوزیشن بالکل محفوظ رہتی ہے۔ اور پھر آج کا المیہ یہ ہے کہ آپ چوٹ تو کسی اور پر کرتے ہیں لیکن آستینیں کوئی اور چڑھاتا ہے۔

میں اپنے ذوق کی تسکین کے لیے مزاح لکھتا ہوں۔ میری مزاح نگاری نے کسی اور کو نہ سہی، کم از کم میری ذات کو تو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ اب مجھ میں وہ حماقتیں باقی نہ رہیں جو اکثر ادیبوں اور شاعروں کی ذات میں سرایت کر جاتی ہیں۔ مثلاً فوٹو اسٹوڈیو کے کوٹ اور ٹائی پر اپنی تصویریں کھنچوانا اور رسالوں میں چھپوانے کے لیے بھجوانا۔ اب میں بالکل ہی ایک سیدھا سادا

www.taemeernews.com

انسان ہوں لیکن اس کے باوجود ہر نیا ملنے والا مجھ سے کچھ گھبرا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی واحد وجہ صرف میری داڑھی ہے۔ میں نے داڑھی محض اس لیے چھوڑ رکھی ہے کہ مجھ میں اور طلباء میں کچھ تو امتیاز رہے۔ لوگ اپنی عمروں کو چھپانے کے لیے داڑھی منڈاتے ہیں۔ اور میں محض اس لیے داڑھی بڑھاتا ہوں کہ لوگوں کو میری عمر کا صحیح اندازہ ہو اور وہ میری بزرگی کا احترام کریں۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنی عمر سے کوئی دس بارہ سال پیچھے نظر آتا ہوں۔ اس میں نہ تو آئینہ کا قصور ہے اور نہ میری بینائی کا۔ بلکہ دوستوں اور ڈاکٹروں کی یہی رائے ہے۔ جس روز میرے دوست احباب میری صحیح عمر پہچاننے لگ جائیں گے تو میں اس وقت داڑھی رکھنے کے فیصلے پر نظر ثانی کروں گا۔ مجھے ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ میری داڑھی پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔ اب تو یہ داڑھی میری شناخت کا واحد ذریعہ بن گئی ہے۔ چنانچہ میرے افسانہ نگار دوست جناب عاتق شاہ جب کبھی میرے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو یہی پوچھتے ہیں کہ "داڑھی ہے؟" "داڑھی کدھر گئی؟"

مصطفےٰ کمال بھی جب مجھ پر مہربان ہو جاتے ہیں تو اپنی مادری زبان کی بجائے سرکاری زبان "تلگو" کو زحمت دیتے ہیں۔

مثلاً: ایکاڈا اُنّادَ گڈّم وانّا؟ (کہاں ہیں داڑھی والے بھائی)؟

جب داڑھی کا ذکر آ ہی گیا ہے تو کیوں نہ میں اپنا بچا کھچا خاکہ بھی کھینچ دوں۔ ویسے یہ کام ایسا ہی ہے جیسے ایک سرجن خود اپنے دست مبارک سے اپنا آپریشن کرنے بیٹھا ہو۔

رنگ: گورا نہ کالا۔ جوانی میں چہرہ اتنا بُرا بھی نہیں تھا کہ حُسن کی بھیک

www.taemeernews.com

ہی نہ ملتی. زندگی میں تین، چار مواقع ایسے بھی آئے کہ بالکل یہی سچویشن پیدا ہوگئی تھی ؎

حُسن جب ملتفت ہو تو کیا کیجئے
عشق کی مغفرت کی دُعا کیجئے

قد: محکمہ پولیس میں بھرتی کے لیے جو معیار مقرر کیا گیا ہے اس سے ایک انچ کم

سینہ: ۳۴ انچ اور کمر ۳۶ انچ۔ اگر پتلون میں بیلٹ نہ لگاؤں تو چلتے وقت دونوں ہاتھوں کو مصروف رکھنے کی نوبت آجائے۔

سر: سر سید احمد خاں کا پایا ہے۔ لیکن دماغ سر سید احمد کا نہیں۔ البتہ اس کے صحت مند ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ورنہ کیا عجب کہ جدیدیت کے نام پر اوٹ پٹانگ قسم کے افسانے لکھنے لگ جاتا۔ بال بہت گھنے لیکن نائی کی غفلت سے جب کبھی سائز میں چھوٹے ہو جاتے ہیں تو سر کے پچھلے حصے کے کچھ بال AERIAL (ایریل) کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے نائی کی خوشامد اس لیے کرتا ہوں کہ وہ میرے سر میں ایریل کا جواز نہ پیدا کرے۔

پاؤں: لیڈیز سائز (LADY'S SIZE) کی تعریف میں آتے ہیں۔ غفلت سے کبھی بیوی کے چپل پہن لوں تو کام نکل جائے۔

وزن: ابھی وہ نوبت ہی نہیں آئی کہ ڈاکٹر گھٹانے کا مشورہ دیں۔ یوں بھی میں ڈاکٹر اور وزن، دونوں سے بے حد گھبراتا ہوں۔

کمزوری:۔ آج کا کام کل پر ٹالنا۔ شاگردوں کے خوف سے ہوٹلوں اور سڑکوں پر کھانے اور پینے (سگریٹ) گھبرانا۔

تصانیف:۔ "سائیڈ سے چلئے" "درپردہ" "چنانچہ" ان میں سے دو تصانیف کو

www.taemeernews.com

اتر پردیش اردو اکیڈمی اور آندھرا پردیش اردو اکیڈمی سے انعامات ملے۔
اولاد: تصانیف کی دُگنی۔

"شگوفہ" کی عدالت میں میرا غیر حلفیہ بیان اَدھورا سمجھا جائے گا اگر میں اپنے افسانہ نگار دوست جناب نعیم زبیری اور ممتاز ادیب جناب داؤد اشرف کا ذکر نہ کروں۔ ان دو حضرات نے میری طنز نگارش کو پسندیدگی کی سند اس وقت بخشی جب کہ کوئی چارہ ڈالتا نہ تھا۔ اگر میرے مضامین میں مزاح کی جھلکیاں ملتی ہوں تو اس کی داد مجھے دیجئے قبول کرلوں گا۔ اور اگر نہ ہوں تو مجھے دوش مت دیجئے، بلکہ اُن دو حضرات ہی سے بازپرس کیجئے کہ کیوں ایک معصوم کو خواہ مخواہ گمراہ کیا!؟

www.taemeernews.com

شاعروں اور ادیبوں کی کالونی

اِدھر گزشتہ چند برسوں سے پچھڑے طبقات کے ساتھ انصاف ہونے لگا ہے۔ ایک دور وہ بھی تھا جب ان کے ساتھ چشم پوشی کا عمل روا سمجھا جاتا تھا لیکن اب یہ عالم ہے کہ ان کی ستر پوشی فری میں کی جارہی ہے۔ یہی نہیں ان کی باز آبادکاری کے لیے "لوانکم گروپ" (LOW INCOME GROUP) کے نام کی کالونیاں بھی بنائی جارہی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اب ہمارے نیتا "ویلفر اسٹیٹ" کا مطلب کچھ کچھ سمجھنے لگے ہیں جب بات انکم (INCOME) کی چل نکلی ہے تو یہ بتا دینا بھی مناسب ہے کہ آج کل انسانوں کو آمدنی کے لحاظ سے مختلف گروپ میں تقسیم کیا جارہا ہے۔ اور خارج قسمت کی مناسبت سے ڈاکٹرس کالونی، پروفیسر کالونی، مڈل انکم گروپ کالونی، لوانکم گروپ کالونی، این جی اوز کالونی، جی اوز کالونی ـــ حتیٰ کہ "جی حضوروں" کی کالونیاں تک وجود میں آگئی ہیں۔ لیکن شاعروں اور ادیبوں کے لیے کوئی کالونی، زیرِ تعمیر تو خیر دور کی بات ہے، زیرِ غور بھی نہیں ہے۔ حالانکہ معاشی نقطۂ نظر سے اگر آپ ان کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ شاعروں اور ادیبوں کا مالیہ ہمارے بعض نیتاؤں کے کردار کی طرح انتہائی مخدوش ہوتا ہے۔ اور ان کو بڑی آسانی سے پچھڑے طبقات کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے شاعر اور ادیب (ادیب کم اور شاعر زیادہ) سال میں دو چار مواقع ایسے فراہم کرہی لیتے

www.taemeernews.com

ہیں جب کہ ان کی گلپوشی ہوئی جاتی ہے۔ لیکن گلپوشی کے ساتھ ساتھ ستر پوشی اور تاجپوشی کی رسم کی ابھی داغ بیل نہیں ڈالی گئی ہے۔ اب محض گلپوشی کی بنیاد پر شاعر یا ادیب کو صاحب جائیداد منقولہ (یا غیر منقولہ) سمجھنا بڑی زیادتی ہے۔

جب شاعروں کو نئی زمینیں وضع کرنے اور ادیبوں کو افسانوں اور ناولوں کے پلاٹ ہموار کرنے سے فرصت ملی تو انھیں خیال آیا کہ ہماری بھی ایک کالونی ہونی چاہیئے۔ لیکن اس وقت تک شہر کے مضافات کی ساری اراضیات ختم ہو چکی تھیں : ؎

گاڑی نکل چکی تھی ٭ پٹری چمک رہی تھی !

تاہم انھوں نے حکومت کی خدمت میں ایک ناقابلِ اشاعت میمورنڈم پیش کیا جس میں بے زمینی دربدری اور خانہ بدوشی کی حکایات درج تھیں۔ حکومت نے میمورنڈم ملاحظہ فرمائے بغیر ہی شاعروں اور ادیبوں سے وضاحت طلب کی کہ آخر آپ لوگ اب تک کہاں تھے ؟ اور کیا کر رہے تھے۔ ؟

جواب دیا گیا کہ "ہم دیر سے سونے اور دیر سے جاگنے کے عادی ہیں۔ ہم اپنے افسانوں کے پلاٹوں غزلوں کی زمینوں اور نظموں کی ہیئتوں میں الجھے ہوئے تھے"!

اس اعتراف پر شاعروں اور ادیبوں سے پوچھا گیا کہ "آخر آپ لوگوں کی ــــ انکم کیا ہے ؟ اور آپ لوگوں کو کس انکم گروپ (INCOME GROUP) میں شامل کیا جانا چاہیئے"؟ ــ جواب دیا گیا "ہماری نہ تو کوئی انکم (INCOME) ہوتی ہے اور نہ کوئی انکم گروپ، ہمارا تو صرف ایک ہی گروپ ہوتا ہے ــ ٹانگ کھینچنے والا گروپ !۔ ہمیں بڑی آسانی سے نو انکم گروپ (NO INCOME GROUP) میں شامل کیا جا سکتا ہے" !

اس معقول جواب پر شاعروں اور ادیبوں کو "پچھڑے طبقات" کے زمرے میں شامل

www.taemeernews.com

کیا گیا۔ اور پھر ان کے لیے نو انکم گروپ (NO INCOME GROUP) کے عنوان سے ایک کالونی جنوب کی سمت میں شہر سے کوئی دس کلومیٹر کے فاصلے پر بنائی گئی تاکہ شاعر پھر شہر کا رُخ ہی نہ کر سکیں۔ اس کالونی کا نام "مخدوش مالیہ نگر" رکھا گیا! ——— اور پھر ایک دن شہر کے سارے شاعر اور ادیب اپنی نزاکتوں اور نحوستوں کے ساتھ اپنے اپنے بال پن (BALL PEN) کانوں پر رکھے "خامہ بگوش" کی طرح "نو انکم گروپ" کالونی میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح شہر کا سارا لٹریچر (مطبوعہ کم اور غیر مطبوعہ زیادہ) مخدوش مالیہ نگر میں منتقل ہو گیا۔ اور پھر کالونی آباد ہو گئی۔ اس طرح شاعری کے میدان میں نئی زمینوں کی تلاش میں رہنے والے شاعروں کو اور جدید ادب کے نام پر مغربی افسانوں اور ناولوں کے پلاٹ چرانے والے ادیبوں کو سچ مچ کی زمین بن گئی۔!

کالونی کیا آباد ہوئی، اُس طرف سے بلاؤں کا داخلہ شہر میں بالکل بند ہو گیا۔ شہر کی ایک جانب سے بلاؤں کے اس مستقل بندوبست پر شہر والوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ تو یہ بھی سوچنے لگے تھے کہ کاش شہر کی باقی تین سمتوں میں بھی شاعروں اور ادیبوں کی اسی قسم کی کالونیاں ہوتیں تو بقیہ تین سمتوں سے بھی شہر میں بلاؤں کے داخلے کی روک تھام کا معقول بندوبست ہو چکا ہوتا۔!

کالونی کیا تھی؟ ——— منی کوارٹرس (MINI QUARTERS) کا ایک مجموعہ تھی۔ شاعروں اور ادیبوں کی کثرت اور جگہ کی قلت نے ایک نئی وضع کی کالونی کو جنم دیا تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کو جو کوارٹرس الاٹ کئے گئے تھے وہ ہو بہو آج کل کی منی کہانیوں کے مشابہ تھے۔ کالونی کے کوارٹروں میں گھر کے مفہوم کو تلاش کرنا گویا منی کہانیوں میں کہانی کے مفہوم کو تلاش کرنے کے برابر تھا۔

www.taemeernews.com

کالونی کی تعمیر میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ کسی شاعر کی بھی انفرادیت محفوظ نہ رہے۔ کوارٹرس اس حد تک مشابہ تھے کہ ایک ہی شعر کے دو ہم قافیہ اور ہم ردیف مصرعے معلوم ہوتے تھے۔ اس یکسانیت کی وجہ سے کوئی بھی شاعر یا ادیب کسی دوسرے شاعر یا ادیب کے کوارٹر کو اپنا کوارٹر سمجھ کر داخل ہوتا اور حسبِ حیثیت بے آبرو ہو کر نکلتا۔

ایک بار یوں بھی ہوا کہ ایک شاعر حالتِ ترنگ میں رات کے وقت ایک دوسرے شاعر کے کوارٹر کو اپنا کوارٹر سمجھ کر گھس گیا۔ اس بے ساختہ تشریف آوری پر صاحب خانہ پہلے تو ہڑبڑا گئے، اور پھر اس شاعر کو دھکے دیتے ہوئے ایک چمن میں لائے اور پھر تحت اللفظ میں خوب صلواتیں سنائیں۔ جب وہ تھک کر خاموش ہو گئے تو ممدوح نے فرمایا: "گالیاں دینی ہی تھیں تو گھر پر ہی دے دیتے! یہاں چمن میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

شاعر بولا "تم بھی ایک عجیب چمن ہو! ہوش کے ناخن لو! تم جنھیں گالیاں سمجھ رہے ہو، وہ دراصل ایک جدید معرا نظم ہے۔ جس کا عنوان ہے "ایک غصیلی نظم۔!" پھر تھوڑے توقف کے بعد بولا:

اگر میں گھر پر ہی یہ نظم سنا دیتا تو گھر میں سوئے ہوئے چھوٹے بڑے بے بحر مصرعے جاگ جاتے اور پھر ہوٹنگ شروع ہو جاتی۔!"

چنانچہ اس قسم کے حادثات اور کوارٹروں کی یکسانیت سے بچنے کے لیے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے کوارٹروں کے نام کی تختیاں لٹکا دیں۔ مثلاً:

"خواب گاہِ خرگوش" ــــ "کاشانۂ گُل فروش" ــــ "آشیانۂ برائلر مرغ" ــــ "گوشۂ احسان فراموش" ــــ "کنجِ قفسِ سوختہ" وغیرہ وغیرہ

www.taemeernews.com

کالونی میں منتقل ہونے کے چند دن بعد شاعروں اور ادیبوں نے "مخدوش مالیہ نگر" کا شارٹ فارم یعنی تخلص "ایم ایم نگر" (M.M.NAGAR) رکھا۔ کیوں کہ کالونی کے نام کا ایک جزو "مخدوش مالیہ" ہونے کی وجہ سے دکانداروں نے شاعروں اور ادیبوں کو غلّہ اور سودا ادھار دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے شاعر اور ادیب "مخدوش مالیہ نگر" کا نام لیتے ہوئے یوں شرمانے لگے تھے جیسے کوئی ہندوستان کی دیہاتی عورت اپنے شوہر کا نام لیتے ہوئے شرماتی ہے۔ پھر تو ہر شاعر اور ادیب کے نام کے ساتھ "ایم ایم نگری" کا دُم چھلّہ نکل آیا۔ ان ایم ایم نگریوں کی کثرت سے تنگ آ کر بالآخر ایک دن ایک ستم ظریف نے ایک ایم ایم نگری کو پکڑ ہی لیا۔ اور پھر پوچھ بیٹھا "تم کون سے ایم ایم نگری ہو ؟ تھرٹی فائیو ایم ایم یا سیونٹی ایم ایم"؟

وہ ایم ایم نگری بھی کچھ کم نہیں تھا۔ تفنن طبع کا دلدادہ اور چھوٹی بحر کا شاعر۔

بولا "چھوٹی بحر کا شاعر ہوں ! یعنی تھرٹی فائیو ایم ایم ! لیکن ایرکنڈیشنڈ ہوں"

ستم ظریف نے چونک کر پوچھا "یہ ایرکنڈیشنڈ کا کیا مطلب"؟

شاعر نے جدید لب و لہجہ میں جواب دیا "ایرکنڈیشنڈ کا مطلب یہ ہے کہ میں ہوادار کپڑے نہیں پہنتا ! حیا دار ہوں۔ ! سلیقے کے کپڑے پہنتا ہوں ! جسم کو ہوا نہیں کھلاتا !"

مخدوش مالیہ نگر میں بعض ایسے شاعر بھی آ بسے تھے جو تواردکے نام پر دوسرے شاعروں کے مصرعے کے مصرعے اُڑا لیتے تھے۔ اور بعض ادیب ایسے بھی تھے جن کا کام افسانوں کے پلاٹ چُرانا تھا۔ پھر تو کالونی میں چوری کا یا زانہ

www.taemeernews.com

گرم ہوگیا۔ شاعر ایک دوسرے کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھنے لگے لیکن اس کے باوجود مصرعوں کے لڑ جانے، خیال کے ٹکرانے اور زمین کو چرانے کی شکایتیں عام ہوگئیں۔ اور عام بھی اتنی کہ نقض امن کا اندیشہ لاحق ہوگیا تھا۔ نتیجتاً پولس کو حرکت میں آنا پڑا۔ ایک دن بعد برخواستِ مشاعرہ دو شاعروں میں خیال کے ٹکرانے، مصرعوں کے لڑ جانے اور زمین کو چرانے کے موضوع پر زبردست بحث چھڑ گئی۔ اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ ہاتھاپائی شروع ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی بیچ بچاؤ کرتا، ایک پولس والا میدانِ سخن کے اُن دو پہلوانوں کو تھانے میں لے آیا۔ شاعروں پر نظر پڑتے ہی انسپکٹر نے پوچھا "کون ہیں یہ دونوں؟ اور کیا حرکتیں کر رہے تھے؟"

کانسٹبل نے اٹینشن ہوکر کہا "سر! یہ دونوں مصرعے لڑا رہے تھے اور زمین چرا رہے تھے۔"

انسپکٹر حیران کہ یہ مصرعے لڑانا کیا ہے؟ اور زمین چرانا کیا ہے؟ کیوں کہ وہ صرف سرکار کی زبان جانتا تھا۔ اور اردو سے اس حد تک واقف تھا کہ مقامی گالیاں دے سکتا تھا۔ ایسے انسپکٹر سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ شاعری کی اصطلاحوں "مصرعہ" اور "زمین" کا مفہوم سمجھ پائے گا۔ چنانچہ انسپکٹر نے "لڑنے" اور "چرانے" کی مناسبت سے "مصرعہ" کو غنڈے کا نام سمجھ کر تحکمانہ انداز میں پوچھا "WHO IS MISRA?"

دو شاعروں میں سے ایک شاعر نے موقع کی نزاکت کو بھانپ کر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں یوں وضاحت کی "مصرعہ کسی کا نام نہیں ہے صاحب! یو ڈٹ... یو ڈٹ... یو تم لائن!"

www.taemeernews.com

انسپکٹر نے شاعر کو سر سے پیر تک گھورتے ہوئے پوچھا؟ "YOU ARE A POET"
شاعر نے "YOU" کی جگہ "یُو" کو رکھ کر جھٹ سے جواب دیا:

"YES, I ARE A POET!"

انسپکٹر نے شاعر کی انگریزی کو تو معاف کر دیا لیکن ابھی غزل کی زمین کا مسئلہ حل طلب تھا۔ وہ اپنے "میں" غزل کی زمین کو "لینڈ" (LAND) سمجھ بیٹھا تھا چنانچہ اس کا محل وقوع جاننے کے لیے پوچھا:

"WHERE IS THE DISPUTED LAND?"

شاعر نے فوراً جواب دیا! "IN MY POCKET"

انسپکٹر حیران کہ زمین جیب میں کس طرح سما سکتی ہے؟ شاعر نے انسپکٹر کی حیرانی کو بھانپ کر بڑے فخر سے کہا: "انسپکٹر صاحب! یہ شاعری ہے، شاعری! پولیس کی ڈائری نہیں ہے۔ شاعر زمین کو تو کیا سورج کو بھی اپنی جیب میں رکھ سکتا ہے۔ بادلوں کو مُرغا بنا سکتا ہے۔ ہوا کے سگریٹ بنا کر انھیں پانی سے سلگا سکتا ہے۔ اور تو اور اردو کا شاعر تو مرنے کے بعد بھی شعر کہہ سکتا ہے۔ آپ نہ تو شعر فہم ہیں اور نہ آپ کا اسٹاف سُخن شناس! آپ سب کے سب بھرتی کے شعر کے مماثل ہیں۔ یہ شاعروں اور ادیبوں کی کالونی ہے۔ یہاں صرف سخن فہم اور شاعر شناس پولیس ہی رہ سکتی ہے۔ آپ فوراً یہاں سے تبادلہ کرا لیجیے۔ ورنہ ہم احتجاج کریں گے"۔ اتنا کہنے کے بعد شاعر نے اپنی جیب سے وہ متنازعہ غزل نکالی جس کی زمین کے دعویدار دو شاعر تھے۔
چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن اس انسپکٹر کا تبادلہ کر دیا گیا اور اس کی جگہ ایک ایسا انسپکٹر آیا جو نہ صرف سخن فہم تھا بلکہ شاعر شناس بھی۔ اس مسرت میں شاعروں نے تھانے میں ایک محفلِ شعر زیرِ صدارت انسپکٹر آف پولیس منعقد

www.taemeernews.com

کی جس میں سامعین کے طور پر کانسٹبل شریک ہوئے۔ جنھیں صدر مشاعرہ نے ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعہ شاعروں کے کلام پر داد دینے کے لیے اُکسایا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا جب کہ شاعروں نے پہلی بار ایک غلط آدمی کو صحیح مقام پر بٹھایا تھا!

اگر ہم شاعروں اور ادیبوں کی کالونی اور وہاں کے شب و روز کی داستان خونچکاں بیان کرتے ہی جائیں تو اندیشہ ہے کہ ملک میں نیوز پرنٹ کی قلت پیدا ہو جائے گی۔ اور ہماری عمر بھی وفا نہ کرے گی۔ البتہ اتنا ضرور بتاتے ہیں کہ کالونی میں سب کچھ تھا ـــــ ادیب تھے، شاعر تھے، ادب تھا، سڑکیں تھیں۔ شراب خانے تھے۔ لڑکھڑا کر گرنے کے لیے گڑھے تھے۔ ہوا تھی۔ سورج تھا۔ (جو دن کے گیارہ بجے طلوع ہوتا تھا) اکاڈمی تھی، پیر دیاں تھیں۔ انعامات تھے۔ غرض کہ ہر چیز تھی لیکن سامع یا قاری نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اگر اتفاق سے کبھی کوئی بھولا بھٹکا سامع اُدھر آ نکلتا تو شاعر اُسے یوں گھیر لیتے جس طرح شکر کی قلت کے زمانے میں شکر کے ایک ذرّے کو بیسیوں مکھیاں گھیر لیتی ہیں۔ وہ ادیب اور شاعر جو کبھی آپسی چندہ سے کافی خانے میں چائے پی کر ادب عالیہ تخلیق کیا کرتے تھے، کالونی میں منتقل ہونے کے بعد فرمائشی، فہمائشی، نمائشی اور انعامی ادب تخلیق کرنے لگے جس میں قاری یا سامع کے دل کی دھڑکن تو کجا، خود فنکار کے دل کی دھڑکن سنائی نہیں دیتی تھی ـــ!

۵۷

www.taemeernews.com

قصۂ درس سناتے ہیں...!

اب ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے کس سال، کس مہینے، کس تاریخ اور کتنے بج کر کتنے منٹ پر پہلی کلاس لی تھی؟ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ پہلی کلاس لیتے وقت دن میں تارے نظر آگئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ کلاس ہم نے نہیں لی تھی بلکہ ہماری کلاس خود طلبا نے لی تھی۔ یہاں یہ وضاحت غیر ضروری نہ ہوگی کہ ہم نے اپنی ملازمت کے لیے پیشۂ تدریس کا انتخاب کیا تھا۔ کیوں کہ ہمیں یہ باور کرایا گیا تھا کہ اگر تم عاقبت میں عافیت چاہتے ہو اور حور و غلماں کی صحبت سے فیض یاب ہونے کی خواہش رکھتے ہو تو پیشۂ تدریس اختیار کرو۔ اس کے علاوہ ہم نے پیشۂ تدریس کی عظمت کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ نظر بندی کے زمانے میں جب شاہ جہاں سے یہ پوچھا گیا کہ وہ اپنی تنہائی اور بوریت کو کس طرح کاٹنا پسند کرے گا؟ ۔ تو ہز مجسٹی نے فرمایا تھا کہ "چند لڑکوں کا انتظام کر دو، میں انھیں پڑھایا کروں گا۔" تاریخ خاموش ہے کہ شاہ جہاں کی اس فرمائش کی تعمیل کر دی گئی تھی یا نہیں۔ البتہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ شاہ جہاں سے سوال کرنے والے کوئی اور نہیں، ان کے لائق و فائق فرزند اورنگ زیب تھے

www.taemeernews.com

جن کے تعلق سے ابن انشاء کا یہ تبصرہ بھی خوب ہے :

"اس نے کوئی نماز قضا نہ کی اور کسی بھائی کو زندہ نہ چھوڑا"

پیشۂ تدریس کی عظمت کے بارے میں ہم نے یہ بھی پڑھ رکھا تھا کہ خلیفہ ہارون رشید کے لڑکے اپنے استاد کی جوتیوں کو اٹھانے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ پیشۂ تدریس کے انتخاب کے وقت ہم بھی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے کہ لڑکے ہمارے آگے پیچھے سر (SIR) سر (SIR) صاحب صاحب کہتے پھریں گے۔ اور ہماری جوتیاں سیدھی کرنے کے لئے آپس میں اس حد تک لڑیں گے نقص امن کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور پولیس کو لاٹھی چارج کرنے کی نوبت آجائے گی۔ ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ جوتیاں سیدھی کرنے کے بہانے وہ اس حد تک لڑیں گے کہ ہماری جوتیاں ہی پھاڑ دیں گے اور مدرس کو ننگے پاؤں فرار ہونے کی نوبت آجائے گی۔

موجودہ دور میں ایک شخص کو پیشۂ تدریس سے وابستہ ہونے اور ٹیچر کے عہدے پر فائز ہونے کے لئے ٹی۔سی یا بی۔ایڈ کا امتحان کامیاب کرنا پڑتا ہے اور اس کورس کی تکمیل کے دوران ایک رنگروٹ کو مختلف مضامین کے عملی اسباق سے گذار کر ٹیچر کے روپ میں ڈھالا جاتا ہے۔ اب یہ ٹریننگ والے پر منحصر ہے کہ آگے چل کر وہ آئیڈیل ٹیچر بنے یا سکسس فل ٹیچر (SUCCESS - FUL TEACHER) کا روپ دھارے۔ آئیڈیل ٹیچر وہ ہے جس کی محدود آمدنی اور محتاط زندگی کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی اسے اپنا داماد بنانے پر راضی نہ ہو۔ سکسس فل ٹیچر (SUCCESSFUL TEACHER) وہ ہے جو مدرسے میں حاضر رہ کر بھی غیر حاضر رہے۔ فرائض منصبی سے دور بھاگے۔ فرصت کے گھنٹے میں

www.taemeernews.com

اسٹاف روم میں رمی[1] کھیلے اور پڑھانے کے گھنٹے میں لڑکوں کو خارج از نصاب سرگرمیوں میں مصروف رکھ کر کرسی پر دراز ہو جاتے (اور اگر کرسی نہ ہو تو لو ربیتے پر لیٹ جاتے).

امتحانات کے زمانے میں لڑکوں کو نقل کے نت نئے طریقوں سے واقف کرائے اور پیروی کر سکے بسٹ ٹیچر (BEST TEACHER) کا ایوارڈ حاصل کرے.

جب میں اپنے حافظے کے اوراق الٹ پلٹ کرتا ہوں تو مجھے ان اوراق میں اپنے زمانۂ طالب علمی کے ایک ٹیچر کا مرقع جھانکتا نظر آتا ہے جو سکیس مل ٹیچر کے زمرے میں آتے ہیں. ذرا ان کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے بشیروانی پہنتے تھے (بھلا اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے). لیکن سینے پر تین چار بٹنوں کو کھلا چھوڑ دیتے تھے تاکہ پتہ چلے کہ شیروانی کے نیچے کیا ہے اور وہاں کس قسم کے زلزلے پرورش پاتے ہیں؟ پنجابی سینڈل پہنتے تھے. لیکن تسمے کو کھلا چھوڑ دیتے تھے جیسے بل ڈاگ کو بھونکنے کے لئے چھوڑ دیا ہو. چنانچہ چلتے وقت بکّل کے ہلنے سے چھن چھن کی آوازیں آتیں. یوں لگتا گویا پاؤں میں گھنگرو بندھا ادنٹ 'اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی' کے مصداق اپنے پاؤں پھینکتا چلا آرہا ہو. کلاس روم میں پہلے چھن چھن کی آوازیں داخل ہوتیں اور پھر تمام طلبا کو متنبہ کرتیں کہ خبردار! سرکس کے رنگ ماسٹر تشریف لا رہے ہیں کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے. پھر اس کے بعد موصوف معہ اپنی نحوست کے داخل ہوتے اور ایک گھمبیر "ہوں" کے ساتھ لڑکوں کی طرف متوجہ ہوتے. ریاضی پڑھانے پر مامور تھے. راتوں میں فرائض غیر منصبی اور فرائض غیر ازدواجی میں مصروف رہتے اور مضمون ریاضی کی مناسبت سے راتوں میں کلب میں "برج"[2] کھیلتے تھے. صبح جب کلاس روم میں داخل ہوتے تو ان کے چہرے پر "برج بھاشا"

---

[1] تاش کا ایک مشہور کھیل. [2] تاش کا ایک کھیل

www.taemeernews.com

برتی رہتی تھی۔ بچوں کا سارا قصور بچوں پر نکالتے تھے۔ اور اس کارِ خیر کے لئے نت نئے بہانے تلاشتے ہیں۔ البتہ ہوشیاری یہ کرتے کہ خرگوش قسم کا دُبلا لڑکا پٹے اور اس کی دھنکائی اور پٹائی کو دیکھ کر باغی قسم کے لونڈے مرعوب ہوں۔ ایک دن نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ ریاضی کا پورا پیریڈ پڑھائی کے بجائے پٹائی کے لئے وقف کیا اور ایک دبو قسم کے لڑکے سے ایک عجیب وغریب سوال پوچھا:

"کبھی کبھی میں جھوٹ بولتوں نہیں"؟

اب لڑکا حیران کہ جواب دے تو کیا دے؟ یہ کوئی درسی سوال تو تھا نہیں کہ لڑکا "ہاں" یا "نہیں" میں جواب دے کر حسبِ استطاعت پٹتا۔ یہ تو اونٹ کی خصلت والے ٹیچر کے وقار کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ دو چار سکنڈ سوچ کر اس لڑکے نے نیک نیتی سے جواب دیا:

"نہیں صاب (آپ جھوٹ نئیں (نہیں) بولتے۔"

تڑ سے ایک چانٹا رسید کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں کوئی ولی ہوں جو جھوٹ نہ بولوں"۔

یہ سنتے ہی لاکھ ضبط کے باوجود ہمارے منہ سے ہنسی نکل گئی۔ پھر کیا تھا۔ شامت ہمارے پاس آگئی۔ پوچھا۔ پوچھا کیا! وہی سوال دہرایا۔

"کیوں رے کبھی کبھی میں جھوٹ بولتوں نہیں"۔

ہم نے سوچا کہ ٹیچر کے احترام پر مبنی مبالغے پر جب ایک طالب علم کی پٹائی ہو سکتی ہے تو کیوں نہ حق بات کا برملا اظہار کر کے پٹیں۔ چنانچہ ہم نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پٹاخ سے جواب دیا۔

"جی ہو صاب آپ جھوٹ بولتے ہیں"!

www.taemeernews.com

ایک گھونسہ رسید کرتے ہوئے فرمایا :

"کیوں رے لونڈے میں جھوٹا ہوں ؟"

اور پھر جنّت کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا :

" استاد کا مار کھایا ہے . تو جنّت میں ضرور جائے گا !"

اس چنگیزی سلوک کی اطلاع ہیڈ ماسٹر کو ملی تو انہوں نے ان کا ٹائم ٹیبل بدل کر ریاضی کے بجائے اُردو پڑھانے پر مقرر کیا ——— دوسرے روز اُردو کے گھنٹے میں کمرۂ جماعت میں داخل ہوئے . لڑکوں کو تین چار اٹھ بیٹھ کروا کر کہا :

"چلو آج غالب کی غزل پڑھتے ہیں !"

پھر ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا :

"پڑھو غالب کی غزل . میں ذرا آپ لوگوں کا تلفظ دیکھنا چاہتا ہوں ." اور پھر بڑی حقارت سے فرمایا :

" پتہ نہیں سابقہ ٹیچر نے آپ کو کیا غیر غلط پڑھایا ہے !"

لڑکے نے مطلع پڑھا :

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

"بہت اچھے ! ہاں تو دوسرا شعر پڑھو ."

لڑکے نے کہا :

"سر ! پہلے شعر کا مطلب ؟"

مولوی صاحب نے جواب دیا .

www.taemeernews.com

"مطلب بالکل صاف ہے آگے بڑھو"!

لڑکے نے دوسرا شعر پڑھا اور پھر پوچھا۔

"سر! مطلب؟"

مولوی صاحب نے کہا:

"مطلب بالکل صاف ہے آگے بڑھو!"

لڑکے نے ایک اور شعر پڑھا: ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس سے پہلے کہ لڑکا پوچھتا کہ "سر! اس شعر کا مطلب"؟ مولوی صاحب نے ہمیں اونگھتے دیکھ لیا جوان کی افہام و تفہیم سے بیزار اور غالب سے بے نیاز ہوکر کہیں غرق ہو گئے تھے۔ اس اثناء غفیل حالت میں ہی پاکر اب کی بار مولوی صاحب نے اپنی توپ کا رُخ ہماری طرف پھیر دیا۔

"بتاؤ اس شعر کا مطلب کیا ہے؟"

چونک کر کتاب پر جو نظر ڈالی تو شعر میں ایک نہیں دو "حق" موجود تھے۔ یعنی کہ دو سنگِ گراں۔ پٹنے کے ڈبل چانس۔ گویا ڈبل پروموشن۔ روتی صورت بنا کر مری آواز میں جواب دیا:

"سر! مطلب بالکل صاف ہے آگے بڑھیے"!

(یعنی کہ پٹیئے اور پھر جنّت کی بشارت دے کر ثوابِ دارین پا یئے!)

www.taemeernews.com

تو عرض کرنا یہ ہے کہ زمانہ کبھی SUCCESSFUL TEACHERS سے خالی نہیں رہا. فی زمانہ تو ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں. بلکہ ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں. صرف تھوڑا سا وقت نکال کر اسکول کے معائنہ کے لئے جانا کافی ہے. آپ کا دل بھی بہل جائے گا اور سکس نمل ٹیچروں سے ملاقات بھی ہو جائے گی. خاطرات ندیم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے. جب کبھی تعلیمی مسائل اور مدرس کے رول کا ذکر چھڑتا تو وہ اپنے وطن مالوف کے حوالے سے ایک واقعہ کو لطیفہ بنا کر سنا دیتے تھے. اور پھر اپنی دائیں ران پر ہاتھ مار کر ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنسی میں شامل کر لیتے تھے وہ لطیفہ نما واقعہ آپ بھی سن لیجئے:

ایک دن ایک انسپکٹر آف اسکولز دیہات کے ایک اسکول کے معائنے کے لئے جیپ میں نکلے. کچھ دور جانے کے بعد ان کو جیپ سے اتر جانا پڑا. کیونکہ آگے راستہ ناقابل عبور تھا. انہوں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ کوئی معقول سا آدمی مل جائے تو راستہ دریافت کریں. اتفاق سے ایک نہیں تین چار معقول آدمی نظر آئے جو قریب والے تالاب میں بیٹھے جھک مار رہے تھے. یعنی مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے (بیکار وقت گذارنے کو جھک مارنا بھی کہتے ہیں). اس موقع کو غنیمت جان کر انسپکٹر آف اسکولز ان کے پاس جا پہنچے. اور راستہ کے بارے میں تفصیلات دریافت کیں. لیکن ان شکاریوں کا راستہ بتانے کا انداز کچھ اتنا زیادہ پیچیدہ تھا کہ ساری تفصیلات بغیر آپریشن کے دماغ میں نہیں گھس سکتی تھیں. چنانچہ انسپکٹر آف اسکولز نے ان سے درخواست کی کہ وہ چل کر جیپ میں تشریف رکھیں اور گائیڈ (GUIDE) کے فرائض انجام دیں. مختصر یہ کہ شکاریوں کی سرکردگی میں جیپ منزل مقصود کو پہنچ گئی. جیپ جب

www.taemeernews.com

گاؤں میں داخل ہوئی تو اس کی آواز پر سرپنچ اور آپا سرپنچ دوڑے دوڑے جیپ کے پاس آئے۔ ان کی آمد سے فائدہ اٹھا کر انسپکٹر آف اسکولز نے پوچھا:

"یہاں اسکول کہاں ہے اور کتنے ٹیچر کام کرتے ہیں؟"

سرپنچ نے جیپ کی اندر والی سیٹوں کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا:

"یہ ہم سے کیوں پوچھتے ہیں؟ یہ آپ اپنے ٹیچروں سے ہی پوچھ لیجئے جو آپ کی جیپ میں بیٹھے ہیں۔"

○

ہم نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ ایک شخص کو پیشۂ تدریس سے وابستہ ہونے کے لئے ٹی۔ٹی سی یا بی ایڈ کا امتحان کامیاب کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کورس کی تکمیل کے دوران ٹریننگ کالج میں لکچررز سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس ضمن میں ہمیں اپنی ٹریننگ کے زمانے کے ایک لکچرر یاد آتے ہیں۔ جن کا وجود کالج میں ایک بھرتی کے شعر کے قائل تھا۔ وہ سینیرز کا حق مار کر پروموشن پر تشریف لائے تھے۔ زبردست PERSONALITY کے حامل تھے۔ لیکن ان کی PERSONALITY میں ہمارے شہر کی پوری MUNICIPALITY آباد تھی۔ ان کو ایک ایم۔ ایل۔ اے۔ کا آشیرواد حاصل تھا جو ایک حفاظتی ہالہ بن کر ان کی پروموشن کا تحفظ کرتا رہتا۔ "CURRENT PROBLEMS" پڑھانے پر مامور تھے۔ لیکن ان کو آتا جاتا کچھ نہیں تھا سوائے پرابلم کھڑا کرنے کے۔ چنانچہ ان کا پیریڈ پرابلم سے شروع ہو کر پرابلم پر ختم ہوتا تھا۔ جہاں کوئی بات بن نہ پڑتی تو جھٹ کہہ دیتے:

"THIS IS THE CURRENT PROBLEM"

www.taemeernews.com

ان کے کرنٹ پرابلموں سے تنگ آکر یار لوگوں نے ان کا نام ہی کرنٹ پرابلم رکھ دیا تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جن دنوں کرنٹ پرابلم والے لکچرر ترقی پر کالج میں تشریف لائے تھے تو انہی دنوں گریڈ اور گرانی الاؤنس کے بڑھنے کے سلسلے میں ملازمین کے نمائندوں اور حکومت کے درمیان مذاکرات زوروں پر جاری تھے۔ اس طرح موصوف کے ہاتھ ایک نیا موضوع آگیا تھا جو ایک ہفتہ تک وقت گزاری کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ جب ایک دن کلاس روم میں داخل ہوئے تو گریڈ اور گرانی الاؤنس کا پرابلم ان کے ساتھ تھا۔ کرسی پر براجمان ہونے سے پہلے کھڑے کھڑے فرمایا:

"آج کا سب سے بڑا گمبھیر مسئلہ بڑھتی ہوئی گرانی ہے۔ حکومت کے پاس پیسہ ہے لیکن وزیر خزانہ قارون بنا بیٹھا ہے۔"

پھر اس کے بعد وزیر خزانہ اور قارون کے حوالے سے ایک تلمیح طلب مصرعہ جو پتہ نہیں کہاں سے اڑا لائے تھے؛ طلباء کی طرف اچھال دیا:

ع بن کے بیٹھا ہے ثانیٔ قارون

اس پر ایک طالب علم نے دکنی میں گرہ لگائی:

ع اس کی ماں کا خلیل خاں مارون

پھر تو پورا پیریڈ تک بندی اور جگل بندی میں گزر گیا۔

ے بن کے بیٹھا ہے ثانیٔ قارون
اس کی ماں کا خلیل خاں مارون

عمل تنقید کے جوش میں ہم یہ بتانا بھول گئے کہ مصرعۂ ثانی میں جہاں "خلیل خاں" استعمال ہوا ہے وہ ہماری تحریف کا نتیجہ ہے ورنہ اصل مصرعہ میں تو خلیل خاں کی جگہ "حلال کا"

www.taemeernews.com

متضاد لفظ استعمال ہوا تھا۔

دوسرے دن طلباء نے گذارش کی کہ "سر! کچھ نوٹس لکھوا دیجئے۔"
تو موصوف نے سوشیالوجی کو کرنٹ پرابلمس سے جوڑنے کی کوشش کی تھی۔

"Socialogy is Considered to be the mother root of other social sciences."

اِس رٹے رٹائے جملے کے بعد اُن کی گاڑی نے آگے بڑھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سارا علمی سرمایہ پھونک کر رکھ دیا گیا ہے۔ چنانچہ گاڑی کو دھکا دینے کے لئے ایک طالب علم نے پوچھا:

"سر! سوشیالوجی کا کرنٹ پرابلمس سے کیا تعلق؟ اور پھر یہ "مدر روٹ" کیا ہے؟"

جواب ملا:

"مدر روٹ؟ یعنی ماں کا روٹ۔"

لڑکے نے حیرت سے کہا:

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

جواب سے سرفراز کیا گیا:

"میں اینگلو اردو میں فرما رہا ہوں۔"

اب ہم کہاں تک ذکر کریں۔ یہ تو صرف ان کے دو تین پیریڈ کا ٹریلر تھا۔ مختصر یہ کہ اس قسم کے ارشادات سے وہ طلباء کی نالج میں فالج پیدا کیا کرتے تھے۔ چونکہ عملی اسباق کے مارکس اور ریمارکس ان کے ہاتھ میں ہوتے تھے

www.taemeernews.com

اس لئے کوئی بھی طالب علم ان کے آگے دم نہیں مارتا تھا۔ جو ٹرینی گاؤں کا اصلی گھی اصلی شہد اور چٹ پٹا اچار کھلے دروازے سے ان کی خدمت میں پیش کرتا، اس کے علمی اسباق کے ریمارکس سبق ملاحظہ کئے بغیر ہی "شاندار" لکھ دیتے تھے اور جو بیچارا ان چیزوں کا متحمل نہ ہوتا اس کے حصے میں عجیب و غریب ریمارکس آتے۔ مثلاً ایک ٹرینی کو جس نے گھی نہیں پیش کیا تھا یوں ریمارک کیا تھا:

"بورڈ پر لکھتے وقت مدرس کے چاک کی آواز سماعت پر بڑی گراں گزرتی ہے۔ چاک کو یوں نہیں یوں پکڑنا چاہیے تھا۔ جب موصوف نے علمی مظاہرے کے طور پر بورڈ پر چاک سے لکھ کر بتانے کی کوشش کی تو چاک، چاک نہیں رہی تھی بلکہ چاک چاک ہو گئی تھی۔"

تاریخ کے ایک سبق میں "سکندر اور پورس" کے ریمارکس یوں لکھے تھے:

"سکندر اور پورس کے قصے کو مدرس اگر کٹ پتلیوں کے ذریعہ پیش کرتا تو سبق انتہائی کامیاب ہوتا۔"

جانوروں سے متعلق ایک سبق میں تو انہوں نے حد ہی کر دی تھی:

"مدرس صاحب گدھے کو کلاس روم میں بہ نفس نفیس پیش کرتے تو لڑکے بڑی آسانی سے گدھے کا سبق سمجھ پاتے۔"

یہ تو صرف مدرسین سے متعلق تھا جو ذکور کی تعریف میں آتے تھے۔ اب ذرا اناث کی طرف آیئے۔ جو لیڈی ٹیچر ان کے اجلاس پر حاضری دیتیں ان کے سبق کے ریمارکس بڑے شاندار لکھ دیئے جاتے۔ اور جو لیڈی ٹیچر اپنے کام سے کام رکھتیں ان کے ریمارکس کچھ اس طرح ہوتے:

"ٹیچر کو چاہیئے کہ وہ گہری اور شوخ رنگ کی لپ اسٹک

www.taemeernews.com

استعمال نہ کریں. گہری لپ اسٹک کی وجہ سے طلبار کی نظریں
ٹیچر کے ہونٹوں پہ ہی مرکوز رہیں اور وہ سبق میں دلچسپی نہ لے سکے".
" ٹیچر کو یہ نہیں چاہیئے کہ دوران سبق اپنے آنچل کو گھڑی گھڑی
ٹھیک کریں. اس عمل سے طلبار کی توجہ میں خلل پڑتا ہے".
" ٹیچر بالکل سیدھے سادے انداز میں کلاس روم میں داخل ہو.
یعنی کہ اس کے چہرے پر خاک اڑتی رہے اور وہ صورت سے بالکل
چڑیل دکھائی دے!
" نظم کو تحت میں پڑھانے کے بجائے ترنم سے پڑھائیں اور
تھوڑی سی ادائیں بھی دکھائیں تو سبق انتہائی کامیاب ہوتا".

قصہ مختصر یہ کہ ایسے خرانٹ قسم کے ممتحن کی موجودگی میں ہمیں پہلی کلاس لینی تھی. اور آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ٹریننگ کے دوران ایک مدرس کو مختلف مضامین کے عملی اسباق سے گزار کر پرکھا جاتا ہے کہ وہ آگے چل کر کس حد تک کامیاب مدرس ثابت ہوگا. چونکہ عملی اسباق کے نمبرات بھی مقرر ہوتے ہیں اس لئے ہر مدرس کو کلاس لینی پڑتی ہے جبکہ لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں. تھیوری کی حد تک تو آپ کچھ دیکھ پڑھ کر یا حسب استطاعت نقل کر کے امتحان پاس کر لے سکتے ہیں. لیکن عملی اسباق کی کامیابی کا سارا دار و مدار ممتحن کے ریمارک اور مارکس پر ہوتا ہے. ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ کرنٹ پرابلم والے جیسے خرانٹ قسم کے ممتحن کی موجودگی میں ہمیں پہلی کلاس لینی تھی. اور اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ ہمیں جس جماعت کے طلبار الاٹ کیے گئے تھے وہ سارے کے سارے مشقی مدرسے (PRACTICING SCHOOL) سے تعلق رکھتے تھے

www.taemeernews.com

جنھیں ٹیچر ز تختۂ مشق بنایا کرتے تھے۔ اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ تختۂ مشق بنتے بنتے وہ اس حد تک قیافہ شناس ہو گئے تھے کہ ٹیچر کے چہرے اور چال ڈھال پر نظر پڑتے ہی بھانپ لیتے کہ وہ کتنے پانی میں ہے؟ اور اس کو جواب کے لئے کس حد تک ترسایا جا سکتا ہے؟ وہ اس راز سے بھی واقف تھے کہ ٹیچر کے سبق کی کامیابی کا دارومدار ان کے جوابات پر ہے ورنہ ٹیچر کو نااہل، ناکام و ناکارہ قرار دیا جائے گا۔ وہ اس وقت تک ٹیچر کے سوال کا جواب نہ دیتے، جواب دینا تو دور کی بات ہوئی، رسماً ہاتھ تک نہ اٹھاتے، جب تک انہیں چاکلیٹ کی پیش کشی کا لالچ نہ دیا جاتا۔ (اس طرح طلباء کی عادتوں کو بگاڑنے میں سکسس ٹل ٹیچر ز کا ہاتھ تھا)۔ چونکہ ہمیں اس راز سے بہت بعد میں واقفیت حاصل ہوئی تھی اس لئے ہم نے پہلی کلاس کے موقع پر چاکلیٹ وغیرہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی بلکہ سبق کو بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ (آئیڈیل ٹیچر جو بننا تھا)۔ ہم نے سبق کو دلچسپ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی حتیٰ کہ ILLUSTRATIONS (توضیحات) تک اپنے مبارک ہاتھوں سے بنائے تھے۔ توضیحات کے ضمن میں سبق کی مناسبت سے ایک ایسی تصویر بھی بنائی تھی جس میں ایک فقیر کو بھیک مانگتا ہوا بتایا گیا تھا۔ ہم نے اس تصویر کو بنانے میں اپنی توانائیاں اس حد تک صرف کر دی تھیں کہ تصویر کو دیکھتے ہی یوں لگتا تھا جیسے فقر و فاقہ کا خاتمہ بس اس پر ہو رہا ہو۔ ہم نے تصویر کے اوپر جلی حروف میں "فقیر" لکھ دیا تھا اور تصویر کے نیچے "تیار کردہ مسیح انجم" ذرا جلی حروف میں لکھ دیا تھا تاکہ لڑکوں پر مدرس کا رعب پڑے اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں کہ ان کو پڑھانے والا کوئی معمولی مدرس نہیں بلکہ ایک بہت بڑا آرٹسٹ

www.taemeernews.com

بھی ہے۔ خیر جناب، ہم پوری طرح کیل کانٹوں سے لیس ہو کر مقررہ وقت پر، مقررہ پیریڈ میں پہلی کلاس لینے کے لئے جماعت میں داخل ہوئے۔ لڑکوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور اسٹانڈ (STAND)، سِٹ (SIT) کروایے۔ اور پھر درس و تدریس کے اصول کے مطابق سبق سے متعلق تمہیدی سوالات کئے۔ لیکن جواب کے لئے نہ تو کسی لڑکے کا ہاتھ اٹھا اور نہ کسی لڑکے کے ہونٹ ہلے۔ بالکل سناٹا جیسے لڑکوں نے اپنے ہونٹ سی لئے ہوں (اور اس سناٹے کو صرف چار آنے والے چاکلیٹ ہی توڑ سکتے تھے)۔ بہر حال کچھ ہو اب سبق کو کسی نہ کسی طرح آگے بڑھانا ہی تھا۔ چنانچہ ہم نے سبق کی مناسبت سے فقیر کی تصویر کو بورڈ پر آویزاں کر کے نہایت ہی آسان سا سوال پوچھا:

"بچو! بتاؤ اس تصویر میں کون ہے؟"

بڑا آسان سا جواب تھا "فقیر"! لیکن کسی مائی کے لال نے نہ تو جواب کے لئے ہاتھ اٹھایا اور نہ ہی جواب دیا۔ تب ہم نے پھر وہی سوال دہراتے ہوئے کہا:

"بچو! بڑا آسان سا سوال ہے۔ ذرا غور سے دیکھ کر بتاؤ کہ اس تصویر میں کون ہے؟"

پھر بھی سناٹا چھایا رہا۔ اور ایسا سناٹا جیسے شہر خموشاں! ابھی ہم آگے کے اقدام کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ایک لڑکے نے ہاتھ اٹھایا:

"سر! میں بتاتا ہوں!"

ہم نے اس کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

"شاباش بیٹے! بتاؤ اس تصویر میں کون ہے؟"

تڑسے جواب دیا "مسیح انجم"۔

www.taemeernews.com

اس جواب کے ساتھ ہی جماعت کے مختلف گوشوں سے ہنسی کی دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔ جی میں آئی کہ بدتمیز لونڈے کو تڑاتڑ پیٹ دیں۔ لیکن ٹریننگ کے اصول کے مطابق لڑکوں کو پیٹنے کا مدرس کو حق نہیں ہے۔ اب مارتے تو کیوں کر؟ اور دوسری بات یہ کہ کلاس کے ایک گوشے میں وہی "پرابلم" والے ممتحن بیٹھے ہمارے سبق کو ملاحظہ فرما رہے تھے گویا ایک نہ شُد دو شُد والا معاملہ تھا۔ تب ہم نے سوچا کہ لڑکوں کو تھوڑا سا اشارہ دے کر سوال کریں تو شاید صحیح جواب ملے۔ چنانچہ ہم نے تھوڑی سی وضاحت کے ساتھ وہی سوال دہرایا۔

"بچّو! تصویر کے اوپر والی تحریر پڑھ کر بتاؤ کہ یہ تصویر کس کی ہے؟"

لڑکوں نے اوپر کی تحریر کی بجائے تصویر کے نیچے والی تحریر پڑھ کر کورس میں جواب دیا "مسیح انجم"۔

اب ہمارے پاس چاکلیٹ تو تھے نہیں جو لڑکوں کو پیش کرکے صحیح جواب لیتے۔

بالآخر مایوس ہو کر پہلے لڑکے سے جو بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا تھا اُسکا نام پوچھا:

"بابا! تمہارا نام کیا ہے؟"

بولا: "مُبشّر!"

ہم نے پوچھا: "تم بَشَر ہو یا بِشر؟"

جواب ملا: "بَشَر بِشر!"

اس طرح سبق کی تمہید ہی میں کوئی بیس پچیس منٹ نکل گئے۔ گھڑی جو دیکھی تو پیریڈ کے ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ تھے۔ اور پندرہ منٹ میں سبق کو ختم کرنا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ پھر تو ہم پر زلزلہ سا طاری ہو گیا۔ یہ دیکھ کر پرابلم والے ممتحن نے قریب آکر پوچھا:

"کیا ہوا؟" ہم نے لڑکھڑاتی زبان میں جواب دیا:

"وہی ہوا جو لڑکوں کو منظور تھا!"

www.taemeernews.com

دُم دار ستارہ "ہیلی" کی یاد میں

دُم دار ستارہ "ہیلی" نمودار بھی ہوا اور غائب بھی ہوگیا۔ لیکن ہم ہیں کہ اس کی دُم کو ابھی تک پکڑے ہوئے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں، سانپ کے گزر جانے کے بعد لکیر کو پیٹنا! پھر بھی غنیمت ہے کہ ہم لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔ دُنیا میں ایسے کتنے لوگ نہیں جن کے سامنے سے سانپ بھی گزر جاتا ہے اور لکیر بھی مٹ جاتی ہے تب کہیں انھیں اپنا فرض یاد آجاتا ہے تو بیوی اور بچوں کو پیٹنے لگ جاتے ہیں لیکن ادیبوں اور شاعروں کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ وہ معمولی واقعہ کو بھی شدّت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ اور عصری حسیّت کا تقاضہ بھی تو یہی ہے کہ ادیب ہو یا شاعر، جو کچھ بھی محسوس کرے اس کا یہ پیغمبرانہ فریضہ ہوجاتا ہے کہ دوسروں کو آگاہی بخشے۔ یہی وہ نازک مقام ہوتا ہے جہاں ادیبوں اور شاعروں سے مضحکہ خیز حرکات سرزد ہوتی ہیں اور مختلف قسم کے لطیفے جنم لیتے ہیں۔ خواہ کچھ ہو، عصری حسیّت کے بغیر ادب عالیہ تخلیق نہیں پاتا۔

چنانچہ اسی عصری حسیّت کے تقاضہ کے پیش نظر ہم نے دُم دار ستارہ "ہیلی" کو دیکھنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ دُم دار ستارہ "ہیلی" ۱۹۸۵ء کے اواخر میں آسمان پر نمودار ہونے لگا تھا۔ سائنس والوں نے اس کے "ویزٹ ویزا" کی جو مدت بتائی تھی وہ کوئی چھ ماہ کی تھی۔ وہ ہر روز رات کے پچھلے پہر آسمان پہ

www.taemeernews.com

نمودار ہوتا اور پھر یہ مژدہ سُناتا :

اُٹھو سونے والو کہ مَیں آگیا ہوں!

مگر ہماری مشکل یہ تھی کہ اس کا ٹائم ٹیبل ہمارے ٹائم ٹیبل سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اس کی سواری (یعنی دُم) جس وقت برآمد ہوتی تھی، وہ ہمارے سوتے کا وقت ہوتا تھا۔ ان ہی دِنوں ہم شہر چھوڑ کر کالونی میں جا بسے تھے۔ ہم کالونی والوں کے لئے نووارد تھے، اور دُم دار سِتارۂ "ہیلی" ہمارے لیے نووارد تھا۔ ہمارے ساتھ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ان ہی دنوں کالونی اور اس کے مضافات میں ڈاکے پڑنے لگے تھے۔ ڈاکوؤں کے حُلیئے کے بارے میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ لُنگی اور بنیان میں آتے ہیں اور تلگو بولتے ہیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہم ریلیکس (RELAX) ہونے کے لیے لنگی استعمال کرتے ہیں اور تلگو بھی بہ خوبی جانتے ہیں بلکہ اسکول میں پڑھاتے بھی ہیں۔ اس طرح ڈاکوؤں کی اہم شناخت اور حُلیہ ہماری شناخت اور حُلیہ سے بڑی حد تک مماثلت رکھتا تھا۔ اب آپ ہی غور کیجئے کہ ایسی "اظہر من الشمس" قسم کی مماثلت رکھنے والا کوئی شخص اندھیرے میں پچھلے پہر دُم دار ستارے کے درشن کے لیے نکلے تو اس کے نحس اثرات شخص مذکور پر نہیں پڑینگے؟ (یہ الگ بات ہے کہ ہم توہمات کے قائل نہیں)۔

ہم نے دُم دار ستارہ "ہیلی" کے مشاہدے کے لیئے جس رات کا انتخاب کیا تھا، اتفاق سے وہ بہت کالی تھی۔ اور حُسنِ اتفاق سے برقی بریک ڈاؤن بھی اسی وقت ہوا تھا جو ہمارے شہر کا طُرّۂ امتیاز ہے۔ ہم نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ اور ایک بے خودی کے عالم میں بیوی اور بچوں کو سوتے چھوڑ کر لُنگی اور بنیان میں ہی گھر سے نکل پڑے۔ لباس کا اہتمام کرنے میں بیوی اور

www.taemeernews.com

بچوں کے جاگ پڑنے کا اندیشہ تھا۔ ویسے ہمیں جانا ہی کتنی دور تھا۔ صرف ایک آدھ فرلانگ تک ہی۔ ابھی کچھ دور جا بھی نہیں پائے تھے کہ یاد آیا کہ عینک گھر پر ہی بھول آئے ہیں۔ چنانچہ عریاں آنکھ سے ہی "ہیلی" کو دیکھنے کا ارادہ کر لیا۔ ابھی ہم دُم دار ستارۂ "ہیلی" کو دیکھنے کے لیے سمت کا تعین کر ہی رہے تھے کہ ایک پولیس والے پر نظر پڑی جو کندھے پر رائفل لٹکائے اور ڈنڈا گھماتے ہماری طرف آرہا تھا۔ اچانک ہماری نظریں آسمان کی طرف اُٹھنے کی بجائے پولیس والے کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس طرح پولیس والا دُم دار ستارہ بن کر ہمارے اور "ہیلی" کے درمیان حائل ہو گیا، جس کے نحس کو سب سے پہلے زائل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے لنگی اور بنیان میں ہماری جو عجیب و غریب ہیئت دیکھی تو تلگو میں تحکمانہ انداز میں پوچھا "اے وَرُو؟ (ఎవరు)" (کون ہے؟)

ہم نے سوچا کہ تلگو دانی کے دریا بہا کر دنداں شکن جوابات دینے کا یہ بہترین موقع ہے۔ اس کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ یوں بھی ہم دنداں شکن جوابات دیتے دیتے اب تک بارہ دانت گنوا چکے ہیں۔ ہم تلگو میں دنداں شکن جواب دینے کے لیے منہ کھول ہی رہے تھے کہ اچانک ڈاکوؤں کا خیال آیا جن کی ایک اہم شناخت تلگو دانی بتائی گئی تھی۔ پھر تو ہم نے تلگو دانی کو طلبہ کے لیے اُٹھا رکھا اور مادری زبان میں جواب دیا "میں ایک رائٹر ہوں!"

پولیس والے کے منہ سے بے ساختہ اردو جملہ نکلا "اچھا! رائٹر! منشی! پھر اتنی رات میں کہاں جا رہا تھا؟"

پھر تو ہم خوش ہوئے کہ وہ شرفا کی زبان (اردو) میں بھی گفتگو کرنا جانتا ہے ــــــ پولیس والے چاہے اردو بولیں، چاہے تلگو بولیں، چاہے انگریزی

www.taemeernews.com

پولیس، ان کی ایک عادت ہوتی ہے بے تُکے سوالات کر کے ہراساں کرنا! اور یہ عادت نہ صرف نیشنل بلکہ انٹرنیشنل سطح پر بھی پائی جاتی ہے۔ اور یہ بھی ایک اہم نکتہ ہے کہ پولیس والوں کے بے تکے سوالات کے جوابات بھی بے تکے انداز میں "فٹافٹ" دینے سے ہی منطق کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا ہے اور نجات کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ گُر نہیں جانتے وہ اکثر پولیس کے چالانات اور جُرمانے بھرتے رہتے ہیں۔ چونکہ یہ سبق ہمیں اس وقت یاد نہیں رہا تھا اِس لیے صاف صاف کہہ دیا" ذرا دُم دار ستارہ کو دیکھنے جا رہا تھا!"

پولیس والے نے پوچھا" وہ دُم دار ستارہ کہاں ہے؟ ذرا مَیں بھی تو دیکھوں!"

ہم نے آسمان کی طرف نظریں دوڑائیں۔ ہماری روح فنا سے بقا کی طرف جاتی جاتی رہ گئی۔ آسمان پر دُم دار ستارہ "ہیلی" نہیں نظر آ رہا تھا۔ پھر تو ہمیں یوں لگا جیسے آسمان پر "ہیلی" کی جگہ پولس والا "ہیلہ" بن کر چمک رہا ہو اور چاروں طرف حدِ نظر تک بس اسی کی دُم پھیلی ہوئی ہو۔ دل میں آیا کہ کہدیں کہ تم ہی دُم دار ستارہ ہو اور خاکی ڈریس پہننے کی وجہ سے آسمان پر پہنچ گئے ہو۔ مگر یہ مناسب موقع نہیں تھا۔ دچول بٹیاخ، کرنے کی صورت میں شبہ کی علّت میں دھر لئے جانے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ ہم نے صاف صاف کہدیا" دُم دار ستارہ اتنی آسانی سے نہیں نظر آتا۔ اس کو تو دوربین سے دیکھنا پڑے گا۔"

"اچھا تو پھر دوربین کہاں ہے"؟ پولس والے نے ایک اور سوال کیا۔

ہم نے تھوڑی سی لیاقت بگھارتے ہوئے جواب دیا" وہ تو میری آنکھ میں ہے"!

یہ سُن کر پولس والا اپنی اصلیت پر اُتر آیا۔ بولا" کیسے اُلّو بنا رہا ہے؟

www.taemeernews.com

سچ سچ بتا کہاں جا رہا تھا؟ ورنہ چالان کر دوں گا۔!"

پھر تو ہماری ساری لیاقت دھری کی دھری رہ گئی۔ اخبارات میں صاف طور پر یہ بتایا گیا تھا کہ دُم دار ستارہ "ہیلی" عریاں آنکھ سے نہیں نظر آئے گا۔ صرف دوربین سے نظر آئے گا۔ ہمیں اپنی بھول پر بڑا افسوس ہونے لگا۔ مگر وہ وقت افسوس کرنے کا نہیں تھا۔ پولیس والے کے چنگل سے بچ نکلنا نہایت ضروری تھا۔ ہم نے سوچا کہ اب سائنس اور دوربین سے کام نہیں چلے گا۔ خدا کو درمیان میں لانا ہی چاہیے۔ کئی دنوں سے نمازیں بھی نہیں پڑھی تھیں۔ قضائے عمری ادا کرنے کا بہترین موقع تھا۔ اور فرار کا حیلہ بھی ــــ طہارت سے تو تھے ہی۔ اور لنگی بھی باندھے ہوئے تھے۔ البتہ فرق صرف اتنا تھا کہ ہماری لنگی گھبراہٹ کی وجہ سے ٹخنوں کو پار کر کے سترِ عورت کی حدود میں آ گئی تھی۔ صرف اسی کو سترِ مَرد میں لا کر تیمم کر کے نیت کر لینے کی دیر تھی۔ واقعی خدا نے کاہلوں کے لیے عبادت کی کیا کیا سہولتیں دے رکھی ہیں۔ اُس وقت تو ہم عبادت کے پورے حدود میں تھے۔ صرف پولیس والا ہی حدود میں حائل تھا۔ چنانچہ ہم نے پولیس والے سے کہا "میں تو نماز کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں تم حائل ہو گئے۔!"

"پھر تو ٹوپی کہاں ہے؟" پولیس والے نے ایک اور سوال کیا۔

ہم نے کہا "تم کو ٹوپی سے کیا غرض؟ یہ تو میرا اور خدا کا معاملہ ہے ــــ دوسروں کے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔!"

یہ سُن کر پولیس والا ذرا نرم پڑ گیا۔ اور پھر بولا "پہلے ہی نہیں بولنا تھا' نماز کو جا رہا ہوں۔ جب سے دُم دار ستارہ، دوربین کیا کیا بول رہا تھا' ہُنھ!

www.taemeernews.com

اس عرصے میں پولیس والا کسی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ اور پھر اس کی لیاقت بھی ہمارے سامنے بالکل عریاں ہو چکی تھی۔ چنانچہ ہم نے اس کی قابلیت کو جانچنے کے لیے تھوڑی سی تسلی دے کر پوچھا "جمعدار صاحب! کیا آپ نے سائنس پڑھی ہے؟" جھٹ سے اعتراف کر لیا "سائنس پڑھی ہوتی تو پھر پولیس میں بھرتی کیوں ہوتا؟"

چونکہ تھوڑی سی بے تکلفی کی فضا پیدا ہو گئی تھی، اس لیے ہم پولیس والے سے معذرت چاہ کر اور دُم دار ستارہ "ہیلی" کے مشاہدے کو اگلے وقت پر ٹال کر گھر کی طرف چل پڑے۔ دُعا یہ کر رہے تھے کہ بیگم صاحبہ بیدار نہ ہوں۔ بیوی اگر پڑھی لکھی ہو تو دُم دار ستاروں اور ستاروں کے ملن کے بارے میں سمجھانا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ خود سمجھ لیتی ہے۔ اور بُرا وقت آن پڑنے پر شوہر نامُراد کو بھی سمجھا دیتی ہے۔ مگر ہماری بیگم تو پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ ہر بات کو مثالوں اور ڈیمانسٹریشن کے ذریعہ سمجھانا پڑتا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں جب سورج کو گہن لگا تھا تو ہماری بیگم نے ڈیمانسٹریشن کے ذریعہ سورج گہن کو سمجھانے کا مطالبہ کیا تھا۔ چنانچہ چاند کو زمین اور سورج کے درمیان لانے کے لیے ہمیں ایک عدد چاند سلطانہ سے فرضی عشق کرنا پڑا تھا۔ سارے لوگ سورج کو گہن لگتے دیکھنے کی تیاریوں میں مصروف تھے، تو ادھر ہم چاند سلطانہ کے فراق میں تڑپ رہے تھے، آہیں بھر رہے تھے۔ اس طرح ہمارے اور بیگم صاحبہ کے درمیان چاند سلطانہ آ گئی تھی جس کے نحس اثرات ہماری بیگم پر پڑے تھے۔ بہت سے ٹوٹکے کروائیں اور ہمارا دیوالیہ نکل گیا۔ تب ہماری بیگم کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ گہن کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے گھر میں کبھی بھی سائنسی موضوعات پر بحث نہیں کرتے۔ اور نہ کوئی سائنس گریجویٹ کو اپنے گھر بلاتے ہیں۔ ہم نے پڑھ

www.taemeernews.com

رکھا ہے کہ سائنس دانوں کے تعلقات اپنی بیویوں سے کبھی بھی اچھے نہیں رہے اور نہ رہتے ہیں۔ لہٰذا سوچ یہی رہے تھے کہ بیگم اگر بیدار ہوں تو دُم دار ستارہ "ہیلی" کے بارے میں کس طرح ڈیمانسٹریشن کر کے سمجھائیں گے؟ اور پھر ہمارے پاس دوربین بھی تو نہیں تھی۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ پولس والے سے چھٹکارا پاکر جیسے ہی ہم گھر میں داخل ہوئے، بیگم ہمیں باتھ روم میں تلاش کر کے بیڈروم کی طرف لوٹ رہی تھیں۔ ہم پر نظر پڑتے ہی پوچھ بیٹھیں "یہ آدھی رات کو کہاں گئے تھے؟ اور وہ بھی لنگی میں!"

ہم نے جھنجھلا کر کہا "کیا ساری پہن کر جانا چاہیئے تھا؟"

بیگم نے ہمارے جو تیور دیکھے تو کچھ سٹپٹا سی گئیں۔ اور پھر ملائم لہجے میں بولیں آخر آپ گئے کہاں تھے؟ میری تو جان ہی نکل گئی تھی!

ہم نے صاف گوئی سے کام لیا" ذرا "ہیلی" کو دیکھنے گیا تھا"!

لفظ "ہیلی" پر وہ چونک پڑیں۔ ان کا چونک پڑنا بھی اپنی جگہ واجبی تھا۔ ادھر ہمارے سسرالی عزیزوں کے گھرانوں میں بے فکرے اور بے کار پھرنے والے نوجوان کو "ہیلا" کہتے ہیں۔ اور "لفظ "ہیلا" ہماری بیوی کی ادبی میراث ہے۔ شک بھری بیوی کو "الف" گرا کر "ی" لگانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ چاہے وہ مونث بعد میں مذکر ہی کیوں نہ نکلے۔ چنانچہ ہماری بیگم نے "ہیلی" کو عورت ذات سمجھ کر یوں کہا" اچھا تو یہ چکر ہے یا تیں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ کہاں رہتی ہے وہ بد ذات "ہیلی"؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں! نام سے تو انگریزنی معلوم ہوتی ہے!"

ہم نے چھیڑنے کے لیے کہا "ہاں! انگریزنی ہے! اور ہے بھی بڑی بد اعمال ہی میں آئی ہے!"

www.taemeernews.com

بیگم نے پوچھا "کہاں رہتی ہے وہ؟ فلیٹ میں رہتی ہے یا کوارٹر میں؟"

ہم نے کہا "وہ کوارٹر میں نہیں بلکہ اپنے ہیڈ کوارٹر میں رہتی ہے!"

بیگم نے پوچھا "شوہر والی ہے یا کوٹھے والی؟"

ہم نے جلتی پہ مزید تیل چھڑکنے کے لیے کہا "کوٹھے والی ہے اور بہت ہی اونچے اور عالیشان کوٹھے پہ رہتی ہے۔ میری تو کیا حیثیت، بڑے بڑے سائنس داں اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں!"

بیگم نے کہا "پھر تو بڑی بے حیا معلوم ہوتی ہے! کیا عمر ہوگی اس کی؟"

ہم نے کہا "عمر پوچھ کر کیا کروگی؟ بہرحال بچے کچھے والی ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جب کہ تمہارے پوتے اور نواسے اس کو اور اس کے بچوں کو دوربینیں لگا لگا کر دیکھیں گے!"

اس پر بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہم نے اخبار میں دُم دار ستارہ "ہیلی" اور اس کی دُم کی تصویر بتائی اور کہا "تم اپنے بچوں سے پوچھ لو، وہ تمہیں اچھی طرح سمجھائیں گے!"

دُم دار ستارہ "ہیلی" ۱۹۸۵ء کے اواخر میں جو نکلنا شروع کیا تو ۱۹۸۶ء کے اوائل تک ہر روز نکلتا ہی رہا۔ اس کے دورۂ خیرسگالی کے آغاز پر تو عوام میں کچھ ہلچل سی رہی اور پھر اس کے بعد جمود سا طاری ہوگیا۔ بزرگوں نے سچ ہی کہا ہے کہ "روز روز کا آنا جانا قدر کو کم کردیتا ہے"۔ اب ہم لوگ "وَن ڈے انٹرنیشنل کرکٹ میچ" کے عادی ہوگئے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارا ادب بھی اب "وَن ڈے میچ" ہوکر رہ گیا ہے۔ کسی زمانے میں ہمارے شاعر جب شعر کہتے تو سمندر کو کوزہ میں بند کردیتے تھے۔ اب جدید شاعروں کے پاس کوزہ ہی نہیں ہے جس میں سمندر کو بند کیا جاسکے۔ خدا بھلا کرے جدید شاعری کا کہ اب تو ایک سطری نظمیں بھی کہی جانے لگی ہیں۔

www.taemeernews.com

جب ایک سطری نظموں کا رواج چل پڑے گا تو ظاہر ہے، ہماری تنقید بھی ایک سطری ہوجائے گی۔ یوں بھی آج کل کے تنقیدی مقالوں میں کام کی سطر صرف "ایک" ہی ہوتی ہے۔ باقی سب تو حوالوں اور حواشی کا پلندہ ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں، جدید شاعر۔ وہ "ایک سانس" کی نظم کہتے ہیں۔ اور واقعی وہ ہیں بھی ایک ہی سانس کے شاعر۔ جب کبھی وہ اپنا کلام سناتے ہیں تو باضابطہ اعلان کرتے ہیں کہ "اب آپ مجھ سے ایک سانس والی نظم سنیئے"۔ ان کی نظم کا وقفہ ایک سانس کے آنے جانے کے وقفہ کے برابر ہوتا ہے۔ ان کے دوست احباب ان کو "ایک سانس کا شاعر" کے نام سے پکارتے ہیں۔ جس دن بھی وہ طیش اور جذبے میں آکر دو سانس والی نظم کہنے کی غلطی کریں گے، اُس دن اُن کی سانس ہی اکھڑ جائے گی۔ دیکھا آپ نے! ہمارے ادب میں کیسے کیسے دُم دار ستارے نمودار ہوتے جارہے ہیں!

غالباً آپ نے پڑھا ہوگا کہ دُم دار ستارہ "ہیلی" پچھتر[۵] سال میں ایک بار نمودار ہوتا ہے۔ پچھلی بار وہ ۱۹۱۰ء میں نمودار ہوا تھا۔ علامہ اقبال نے ۱۹۱۰ء میں جب دُم دار ستارہ "ہیلی" کو دیکھا تھا تو اس وقت کی عصری حسیّت کے تقاضہ کے تحت یوں فرمایا تھا "اگلی بار مَیں دُم دار ستارہ "ہیلی" کو اپنے پوتے کی آنکھ سے دیکھ سکوں گا"۔ اقبال چونکہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک فلسفی بھی تھے، اس لیے انہوں نے اپنے تسلسل کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا تھا۔

اب ذرا براعظم ایشیاء سے باہر قدم نکالئے۔ امریکہ میں ایک مشہور ادیب گزرے ہیں جن کا نام ہے مارک ٹوئین۔ ان کا تعلق ہمارے قبیل سے تھا۔ وہ انگریزی میں مزاح لکھتے تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۳۵ء میں اس دن ہوئی جس دن دُم دار ستارہ "ہیلی" آسمان پہ جلوہ افروز ہوا تھا۔ اس واقعہ کے پچھتر[۷۵]،

www.taemeernews.com

سال بعد مارک ٹوئین نے اپنے ہم عصر ادیبوں اور احباب سے کہا تھا کہ "میں اور "ہیلی" ۱۸۳۵ میں ایک ساتھ ظہور میں آئے تھے۔ اور اب ۱۹۱۰ میں ہم دونوں کا ساتھ اکٹھا رہے گا!"

مارک ٹوئین نے جب یہ بات کہی تھی تو کسی نے بھی ان کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ اور ان کی بات کو "مسخرے پن" پر محمول کیا گیا تھا۔ مزاح نگاروں کے ساتھ یہی تو ہوتا آیا ہے۔ مزاح نگار مزاح کے پردے میں جب کوئی سنجیدہ بات کہہ جاتا ہے تو لوگ اس کی بات کو "مسخراپن" پر محمول کرتے ہیں۔ آخر وہی ہوا جس کا ہونا تھا۔ اُدھر اپریل ۱۹۱۰ میں دُم دار ستارہ "ہیلی" آسمان پر نمودار ہوا، اِدھر اس کے اگلے روز ہی مارک ٹوئین اس دُنیا سے رخصت ہوئے۔

دوسری طرف ہمارے شاعروں کو لیجئے۔ وہ بھی اپنی بیماری کے زمانے میں اپنی موت کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض شاعر تو قطعۂ تاریخ بھی نکال لیتے ہیں۔ لیکن انتقال فرماتے نہیں۔ اور جیسے ہی علاج کے لیے مالی اعانت کی سبیل نکل آتی ہے وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جاتے ہیں۔

ہم نے بزرگوں سے سُنا اور کتابوں میں پڑھا بھی ہے کہ دُم دار ستارے سربراہانِ مملکت اور نیتاؤں پر بھاری ہوتے ہیں۔ پچھلی صدیوں میں جب کبھی دُم دار ستارہ نمودار ہوتا تو راجے، مہاراجے، ظلِّ الٰہی، ظلِّ سُبحانی، پرنس، پرنسس حتیٰ کہ ایمپرر تک اپنی ایکٹنگ بھول کر توبہ تلّا میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اور پھر ہر طرف انّ دان، دستر ادان، بھو دان جیسے فلاحی کاموں کا آغاز ہو جاتا تھا۔ یہ دیکھ کر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ـــــ غرض کہ ساری رعایا اپنے نیتا اور حکمراں کی سلامتی کے لیے دُعائیں کرتی۔ اور ان دعاؤں کا ایک سیکولر ہالہ

www.taemeernews.com

"پروٹیکشن فورس" بن کر نیتا کی حفاظت کرتا۔ ویسے، کہنے کو آج بھی لفظ "سیکولر" نعرے کی شکل میں موجود ہے، لیکن رہنماؤں کا حفاظتی سیکولر ہالہ کہیں غائب ہو گیا ہے۔ اب دنیا کے بڑے بڑے حکمراں اور نیتا رہنماؤں کے ہالے کی جگہ بلٹ پروف، فائر پروف، واٹر پروف، ساؤنڈ پروف، شاک پروف یونیفارم پہنتے ہیں۔ اور دُم دار ستارے بن کر عالمی امن کے نام پر ساری دنیا میں نحوست پھیلاتے ہیں۔

دُم دار ستارہ "ہیلی" آیا اور چلا بھی گیا۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ اس کی آمد سے دنیا میں ایک زبردست ہلچل مچ جائے گی اور ہمارے نیتا راہِ راست پر آجائیں گے۔ اور پھر فلاحی اور خیر خواہی کاموں کا ایک نیا پنج سالہ منصوبہ روبہ عمل لایا جائے گا۔ لیکن افسوس کہ دُم دار ستارہ "ہیلی" کا دورہ تو انتہائی خیر سگالی دورہ ثابت ہوا۔

نجومیوں نے کہہ رکھا ہے کہ دُم دار ستارہ جب کبھی نمودار ہوتا ہے تو کچھ لے جاتا ہے اور کچھ دے جاتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دُم دار ستارہ "ہیلی" نے دنیا کو کیا دیا اور یہاں سے کیا لے گیا۔ تو عرض ہے کہ دُم دار ستارہ "ہیلی" دنیا کے سارے سیاسی سرغنوں کو ان کے حال پر چھوڑ گیا اور اپنی دُم صاف بچالے گیا۔ البتہ جاتے جاتے مجسمے ضرور دے گیا ہے۔ اب ہماری ساری تہذیب حسین ساگر کنٹہ پر آکر منجمد کھڑی ہے۔ اگر مجسموں پر خرچ شدہ رقم ہمیں دی جاتی تو ہم خود حسین ساگر کنٹہ پر لسانی ہم آہنگی کی خاطر مہا کوی ویمنا کی جگہ میک اپ کر کے کھڑے ہو جاتے اور راہیروں کو ویمنا کی اخلاق اور تصوف سے بھری نظمیں (پدیالو) سناتے۔ نخت میں نہیں بلکہ ترنم سے

www.taemeernews.com

یہ دیکھ کر ویمنّا کی روح بھی خوش ہو جاتی کہ چلو کوئی اور نہ سہی کم از کم ایک اردو والا تو میرے پیام کو عوام تک پہنچانے کو مِلا، اور وہ بھی ترنم سے!

۱۱

www.taemeernews.com

مردوں کی شمشیریں

یہ راکٹ کا دور ہے۔ راکٹوں کے اس دور میں شمشیروں کا کیا کام؟ چنانچہ تاریخی شمشیروں کو میوزیموں میں سجادیا گیا ہے۔ تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت مورخ کے کام آئے۔ اب یہ شمشیریں مورخ کے انتظار میں لیٹی لیٹی زنگ آلود ہوگئی ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک کوئی چیز زنگ آلود یا پُرزے پُرزے نہیں ہو جاتی اس کا آثارِ قدیمہ ہونا، مورخ کی نظر میں مُستند قرار نہیں پاتا۔ ہاں تو ہم یہ کہنا چاہتے تھے کہ آج کل شمشیر کا جلوہ عام نہیں ہے۔ البتہ کبھی کبھار کسی تھیٹر کے اسٹیج پر اس کا دیدار عام ہو جاتا ہے جب کہ کوئی تاریخی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہو۔ لیکن وہ شمشیر اصلی نہیں بلکہ لکڑی یا ٹین کی بنی ہوتی ہے تاکہ اس کو گھماتے وقت مہاراج کے ہاتھ میں موچ نہ آنے پائے۔ اور ویلن پر وار کرنے میں بڑی سہولت بھی ہو۔ اور وہ اس وار کی تاب بھی لا سکے۔ بلکہ مقدور ہو تو "ایک اور عنایت ہو!" عرض کر سکے۔ اگلے وقتوں کے ناظرین تو اس قسم کے سین پر "ونس مور" کہا کرتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں ویلن کو پھر ایک بار اُٹھ کر، یعنی زندہ ہو کر، خم ٹھونکنا پڑتا تھا۔ اور پھر مہاراج کے تلوار گھمانے پر اسٹیج پر شہید ہو کر لیٹنا پڑتا تھا۔

ڈرامہ کے ذکر پر ہم کو کالج کے زمانے کے مرزا صاحب یاد آ گئے جو کالج

www.taemeernews.com

کے ایک ڈرامہ میں شیطان کا پارٹ ادا کیا کرتے تھے۔ اور نماز کے پابند بھی تھے ایک بار موصوف عین ڈرامہ کے آغاز پر کہیں غائب ہو گئے۔ چنانچہ ان کی تلاش بڑی تیزی سے شروع کر دی گئی۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد ایک شخص دوڑا دوڑا ڈائریکٹر کے پاس آیا اور ہانپتا ہوا بولا "فکر کی چنداں ضرورت نہیں۔ شیطان مل گیا ہے اور وہ اس وقت کالج کے ورانڈے میں مغرب کی نماز پڑھ رہا ہے"۔

بات شمشیر کی ہو رہی تھی۔ لیکن درمیان میں اسٹیج اور ڈرامہ کی بات آ گئی۔ یوں بھی؛ بقول شیکسپیئر، دنیا ایک اسٹیج ہی ہے۔

جب مرد دنیا کے اسٹیج پر سن شعور کو پہنچ کر عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اِسے سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اور اس جدوجہد کے دوران اس سے ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ جب کہ وہ ایک عورت کو بیاہ کر لے آتا ہے۔ ویسے قدرت کا قانون بھی یہی ہے کہ مرد غلطی کرے! —

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

اگر مرد غلطی نہ کرتے (یعنی شادیاں نہ کرتے) تو ہر طرف بیچلرس ہی بیچلرس نظر آتے۔ نتیجتاً ساری دُنیا "بیچلرس کوارٹرس" کا نمونہ بن جاتی۔ اور "مجرد گاہ" کے نام سے موسوم ہوتی —!

مرد کی عملی زندگی کے مطلع پر عورت بیوی کے روپ میں گھونگھٹ ڈالے نمودار ہوتی ہے۔ دراصل گھونگھٹ کے اندر بیوی نہیں بلکہ نیام میں رکھی ہوئی شمشیر ہوتی ہے۔ زندگی کا یہی وہ موڑ ہوتا ہے جہاں سے مرد کو شمشیر سے پالا پڑتا ہے۔ یہ شمشیر دو دھار والی بھی ہو سکتی ہے اور ایک دھار والی بھی؛ چمکنے والی بھی ہو سکتی ہے۔ اور نیام میں بند رہنے والی بھی۔ غرض ان تمام باتوں کا انحصار مرد کے برتنے

www.taemeernews.com

اور مزہ چکھنے پر ہے۔ اور جو مرد شمشیر کو برتنے کا ہُنر جانتا ہے وہی مرد شمشیر زن شمشیر جنگ کہلانے کا مستحق بھی ہوتا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اسلاف تلوار کا نام، اس کی کاٹ، بناوٹ، صلاحیت اور کارکردگی کی مناسبت سے رکھا کرتے تھے۔ اس طرح انواع واقسام کی تلواریں وجود میں آتی گئیں، یہاں ہم تلواروں کے ناموں کی مناسبت سے مَردوں کی شمشیروں عرف بیویوں کے پیکر تراشتے ہیں۔

شمشیر پیکر: شمشیر پیکر بیوی سیدھی بھی ہو سکتی ہے اور ٹیڑھی بھی۔ اگر مرد کا پالا "ٹیڑھی" سے پڑے تو اس کو چاہیے کبھی بھی اُسے سیدھا کرنے کی غلطی نہ کرے۔ بلکہ وہ خود بھی ٹیڑھا ہو جائے۔ شمشیر پیکر بیوی چاہے سیدھی ہو یا ٹیڑھی مگر ہوتی ہے بڑی تیز و طرار قسم کی وہ جب تن کر کھڑی ہو جاتی ہے تو مَرد کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ شمشیر پیکر بیوی کی موجودگی میں شوہر نامدار ایک نیام میں دو تلواریں رکھنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ جو مرد کسی خاص ماہ کی پہلی تاریخ کا چاند دیکھ کر شمشیر کو دیکھنا پسند کرتے ہیں، ایسے مَردوں کے لیے شمشیر پیکر بیویاں بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شمشیر پیکر بیوی کی موجودگی میں چاند کو دیکھنے کے بعد شمشیر کو دیکھنے کے لیے شوہر کو کسی میوزیم تک جانے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی۔ بس اُدھر مطلع پر چاند کو دیکھ لیا اور پھر پلٹ کر بیوی کی ایک جھلک دیکھ لی۔ بیوی کی بیوی شمشیر کی شمشیر! لیکن اس میں ایک مجبوری بھی حائل ہے۔ فرض کیجیے کہ اُدھر آپ مطلع پر چاند کو دیکھ رہے ہوں اور اِدھر آپ کی شمشیر پیکر اہلیہ رسوئی گھر میں آٹا گوندھ رہی ہو، تو اس کے میک اپ کرکے آنے تک نہ صرف چاند بلکہ چاند رات کے گزر جانے اور تاریخ کے بدل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

www.taemeernews.com

فیل پیکر : بھاری بھرکم تن و توش رکھنے والی بیوی فیل پیکر کی تعریف میں آتی ہے۔ اس کا ڈیل ڈول ملاحظہ فرمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسی بیوی کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ حتیٰ کہ شوہر نامراد بھی اس کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ چونکہ وہ اپنے سامنے بھاری بھرکم جہیز لاتی ہے اس لیے شوہر اسے برداشت کرلیتا ہے۔ (کرلیتا ہے کیا، کرلینا پڑتا ہے) اس سلسلے میں ایک نوجوان کا قصّہ بڑا قہقہہ انگیز ہے جس نے بھاری بھرکم جہیز کے لالچ میں پڑکر ایک فیل پیکر سے شادی کی تھی۔ شادی کی رات کو جب اس نے اپنی دلہن کا گھونگھٹ اُلٹا تو فیل پیکر کو دیکھکر چکرا گیا۔ صبح ہوئی تو دلہن نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

"اجی! مَیں کس کس کے سامنے نکلوں اور کس سے پَردہ کروں؟"

شوہر جل کر بولا "سب کے سامنے نکلو! صرف مجھ سے پَردہ کرو!"

پچھلے چند برسوں سے اُونچے گھرانوں میں فیل پیکر بیویوں کا تناسب کچھ بڑھتا جارہا ہے۔ ان کا تناسب بڑھے یا گھٹے، لیکن یہ ہوتی ہیں بڑی خوش مزاج۔ یہ خوش مزاجی دراصل ان کی اپنی مجبوری بھی ہوتی ہے' ان کا بھاری بھرکم وجود اُن کو خوش مزاجی کا سبق سِکھلاتا ہے۔ ان کے بیٹھنے میں پندرہ منٹ لگتے ہیں تو اُٹھنے میں آدھا گھنٹہ، صرف ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی خوش مزاجی کے بَل بوتے پر اپنے شوہروں سے گھر کا سارا "پینڈنگ ورک" کرواتی ہیں۔

پری پیکر اور حُور پیکر :- پری اور حور ـــــ چونکہ ایک ہی شعر کے دو مصرعے کی مانند ہیں اس لیے ہم ان کا ذکر ایک ساتھ کرتے ہیں۔ پری اور حور کا وجود تو دنیا میں ہے ہی نہیں۔ دراصل یہ ساری آگ، شاعروں اور رومانی ناول نگاروں کی لگائی ہوئی ہے۔ ایک شاعر نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ حور پیکر دوشیزہ کو دیکھ کر چاند

www.taemeernews.com

شرماتا ہے اور پری پیکر دوشیزہ کو دیکھ کر کلی کھلنا سیکھتی ہے۔

ہمارے بعض رومانی ناول نگار تو پری پیکر اور حور پیکر دوشیزاؤں کے حلق کی پان کی لالی تک دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ گویا گوشت کا بنا ہوا حلق نہ ہوا بلکہ ٹرانس پیرنٹ شیشہ ہوا! اس قسم کے کرداروں کے ناول پڑھی ہوئی بیوی اپنے آپ کو پری پیکر اور حور پیکر تصور کرنے لگتی ہے۔ لہٰذا وہ سسرال میں فساد کی جڑ قرار پاتی ہے۔ پری پیکر اور حور پیکر بیوی پر ہمیشہ نرگسیت طاری رہتی ہے۔ اس کو آئینہ اور بناؤ سنگار سے فرصت ہی نہیں ملتی۔

اژدھا پیکر: جس عورت کی زبان گز بھر کی ہوتی ہے، وہ اژدھا پیکر بیوی کی تعریف میں آتی ہے۔ اس کے آگے کسی ایک کی نہیں چلتی۔ اس کو بول کر مکر جانا بھی خوب آتا ہے۔ یہ اپنے شوہر کو داب کر رکھتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ شوہر پر بُرا وقت آن پڑنے پر اس کو پس پشت ڈال کر خود آگے بڑھ جاتی ہے ایسی بیوی کو الیکشن کے موقع پر کسی سیاسی پارٹی کا ٹکٹ دے کر سیاست کے میدان میں اتارا جا سکتا ہے۔ چونکہ اژدھا پیکر بیوی کی زبان ہمیشہ چلتی رہتی ہے اس لیے شوہر کو محض مفاہمت کی خاطر ہمیشہ مسکراتے رہنا پڑتا ہے۔ اور یہ عادت اس پر اس قدر غالب آجاتی ہے کہ وہ سوتے میں بھی مسکراتا رہتا ہے۔

سیماب پیکر: جس عورت کے جسم میں بے پناہ لوچ ہو ایسی بیوی سیماب پیکر کہلاتی ہے۔ سیماب پیکر بیوی کا قدم سسرال میں ٹکتا ہی نہیں۔ چنانچہ وہ اپنی سسرال میں ہمیشہ ایک ٹانگ پر کھڑی رہتی ہے۔ اور وہ اس وقت تک اسی پوزیشن میں کھڑی رہتی ہے جب تک کہ میکہ سے بلاوا نہیں آتا۔ اس کی عمر کا بیشتر حصّہ سفر اور سیاحی میں گزرتا ہے۔

www.taemeernews.com

سیماب پیکر بیوی کا شوہر ہمیشہ تلاش رہتا ہے۔

بیوی چاہے پری پیکر ہو یا فیل پیکر، بہرحال بیوی ہوتی ہے۔ اور گھروں میں بیویوں ہی کا سکہ چلتا ہے۔ چاہے کھرا ہو یا کھوٹا!

ع

جہادِ زندگانی میں، یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

■■

www.taemeernews.com

مجسّمے بولتے ہیں!

مہاتما گاندھی جی کا یہ قول خونِ دل سے لکھنے کے قابل ہے کہ غلط طریقوں سے صحیح نتائج کے برآمد ہونے کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ہمارے ملک کے پیشہ ور سیاست داں گاندھی جی کے اس قول کو پچھلے چالیس سال سے غلط ثابت کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ ان کوششوں میں غلطیوں پر غلطیاں کرتے۔ غلطیوں کی سنچریاں بناتے جارہے ہیں، اور آؤٹ نہیں ہو رہے ہیں آپ نے غالباً دیکھا ہوگا کہ چند برس پہلے حسین ساگر پر چند مجسمے کھڑے کئے گئے تھے جن کا مقصد شائد حسین ساگر کی شوبھا بڑھانا تھا۔ لیکن یہ مجسمے فضائی آلودگی اور بسوں اور گاڑیوں سے خارج ہونے والے دھوئیں کی وجہ سے دن بدن کالے ہوتے جارہے ہیں بلکہ بعض مجسمے تو کھانسنے بھی لگے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی کھانسی کسی کو سنائی نہیں دیتی۔ اگر بے حسی کا یہی حال رہا تو اندیشہ ہے کہ کسی دن یہ مجسمے اپنے چبوترے سے چھوڑ کر احتجاجاً سڑک پر آجائیں گے۔ اور لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو کیا عجب کہ انتخابات کے بعد شکست خوردہ لیڈر خود مجسموں کے میک اپ میں ہاتھوں میں وزیٹنگ کارڈ تھامے، رات کے وقت حسین ساگر پر چمکار دکھانے لگ جائیں اور فجر کے ساتھ غائب ہو جائیں۔ ہمارے دل میں کچھ اسی قسم کے وسوسے پرورش پا رہے تھے کہ ایک دن پتہ نہیں کس نے یہ بات اڑائی کہ حسین ساگر پر مجسمے بولنے

www.taemeernews.com

لگے ہیں! اس ایک سطری سنگل کالم کی خبر نے وہ غضب ڈھایا کہ شہر میں افواہوں کا بازار گرم ہوگیا اور ہوٹلوں کا کاروبار چمک اٹھا۔

بن کھڑت بات بھی کیا جذب و اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

ہونٹوں سے نکلی ہوئی بات بنٹوں میں ہوٹلوں، شراب خانوں اور قہوہ خانوں سے ہوتی ہوئی دیوان خانوں اور زنان خانوں تک پہنچ گئی۔ حتیٰ کہ ہمارا زنان خانہ جو دیوان خانہ، نعمت خانہ، مرغی خانہ اور خانہ خانہ سب کچھ ہے، اس کی زد میں آگیا۔ وہ گھر جہاں روزانہ ہمارے غیاب میں اڑوس پڑوس کی ساس بہو کے قصے اور مسائل زیرِ بحث آتے تھے، اچانک افواہوں کی بھٹی میں تبدیل ہوگیا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ گویا براڈکاسٹنگ کارپوریشن" میں "تبدیل ہوگیا۔ چنانچہ اس دن گھر میں قدم رکھتے ہی بیگم نے پوچھا "کیا خبر لائے ہو؟ کیا یہ سچ ہے کہ حسین ساگر پر مجسمے بولنے لگے ہیں؟ اور اگر بولتے ہیں تو کیا بولتے ہیں؟ اور کیسے بولتے ہیں؟"

ہم نے ان سارے سوالوں کے جوابات دینے کی بجائے بیگم کو چُپ کروانے کے لیے کہا "کیسے کیا، منہ سے بولتے ہیں! اور کیسے بولتے ہیں؟"

بیگم بھی کب چُپ رہنے والی تھیں۔ بولیں "اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ منہ سے بولتے ہیں! لیکن یہ بتائیے کہ کس زبان میں بولتے ہیں"؟۔

ہم نے کہا "بیگم ذرا آہستہ بولو! اور زبان کا مسئلہ مت چھیڑو! کسی نے سُن لیا تو فساد کا آغاز یہیں سے ہوجائے گا اور ہمارے گھر کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ اب رہی مجسموں والی بات تو میرا یہ خیال ہے۔ (جس سے تمہارا متفق ہونا کوئی ضروری نہیں) کہ مجسمے بول نہیں رہے ہیں بلکہ ڈھول اور ڈھولک کی وجہ سے کچھ سننے

www.taemeernews.com

لگے ہوں"!

بیگم نے پوچھا "کیا کسی نے ان کی کھانسی سنی ہے؟ کورس کی شکل میں کھانستے ہیں یا الگ الگ؟

ہم نے سمجھایا "ان کو کھانستے کسی نے نہیں سنا! ہو سکتا ہے مجسمے کھانسنے میں بھی احتیاط برتتے ہوں۔ تاکہ لوگ اُن کی کھانسی کو سیاسی اور مذہبی رنگ دے کر تلگو کھانسی، اردو کھانسی، ہندی کھانسی، مرہٹی کھانسی، کنڑا کھانسی کا الزام نہ لگائیں اور پھر انھیں زندہ جان کر توڑ پھوڑ شروع نہ کردیں۔ آخر مجسموں کو بھی تو اپنا احترام عزیز ہوتا ہوگا"۔

بیگم بولیں "میں تو صرف ایک ہی کھانسی جانتی تھی ــــ کالی کھانسی، جو بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ آپ نے تو اتنی ساری کھانسیاں گنوادیں۔ جب اردو کھانسی کی بات آ ہی گئی ہے تو لگے ہاتھ ذرا اردو کھانسی کھانس کر بھی دکھائیے۔ آپ تو اردو کے ادیب ہیں نا"!

ہم نے کہا "بیگم اب مجھے زیادہ طیش مت دلاؤ! اگر میں اردو کھانسی کھانسنے لگ جاؤں تو اندیشہ ہے کہ کھانسی کے ساتھ ساتھ خون بھی آجائے"!

پھر یوں ہوا کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر باہر اس افواہ نے سارے شہر کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ لوگ کام دھام چھوڑ کر تبصروں میں مصروف ہو گئے۔ کوئی اسے قربِ قیامت کے آثار بتانے لگا، تو کوئی اسے ہمارے نیتاؤں کی کارستانیوں کا کرشمہ! شاعروں کو موضوعِ سخن جو ہاتھ آیا تو ہجر کی راتوں کو پیالوں میں گھولنے لگے۔ مسخرے لطیفے گھڑنے لگے صحافی ضمیمے اور سپلیمنٹ کے لیے مواد اکٹھا کرنے لگے اور جن لوگوں کو اس کی ہوا نہیں لگی تھی وہ راہروں سے پوچھ پوچھ کر جھڑکیاں سننے لگے۔ چنانچہ اسی تجسس میں ایک رکشا والے نے حسین ساگر کی طرف سے آنے والے ایک رکشا والے کو روک کر پوچھا "استاد! ادھر سب خیریت تو ہے نا! سنا ہے کہ حسین ساگر پہ مجسمے کھانسنے

www.taemeernews.com

لگے ہیں اور اگر بولتے ہیں تو سرکاری زبان میں بولتے ہیں یا انٹرنیشنل زبان میں، یا پر لوک کی زبان میں ؟"

وہ رکشا والا جو سماعی علم کے بل بوتے پر دورانِ گفتگو ایک آدھ انگریزی لفظ ناقابلِ معافی تلفظ میں بولنے کا دلدادہ تھا، بولا "یہ حیدرآباد ہے، استاد! جیلی اڑی تو بھینس اڑی! یہ سب پروپ بنڈہ ہے"!

لفظ بنڈہ سن کر پہلا رکشا والا جو صورت سے نان میٹرک معلوم ہوتا تھا، ہنسا اور پھر بولا۔ "یہ نیا بنڈہ کہاں سے پیدا ہوا استاد؟ باہر سے آنے والے لوگوں کو چکر دینے کے لیے شاہ علی بنڈہ، پھسل بنڈہ، الآ بنڈہ، لور بنڈہ، بڑا بنڈہ جیسے محلوں کے نام ہی بہت ہیں۔ اب مزید "بنڈے" برداشت نہیں کیے جا سکتے! تو جو کہنا چاہ رہا ہے وہ لفظ پروپ بنڈہ نہیں، پروپیگنڈہ ہے"!

اس اصلاح کو اپنی توہین سمجھ کر دوسرا رکشا والا ذاتیات کی سطح پر اتر آیا:

"ابے او دکنی انگریز! تو زیادہ قابلیت مت جھاڑ! میں ابھی تیری ہسٹری کھول دوں گا!"

پہلے رکشا والے نے پھر تصحیح فرمائی۔

"ارے وہ لفظ "ہسٹری" نہیں، ہسٹری ہے ہسٹری!"

اس سے پہلے کہ بات بڑھتی وہ وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔

اسی افواہ کو بہانہ بنا کر جب ایک سڑک چھاپ فرہاد نے کالج کی ایک تیز و طرار طالبہ کا راستہ روک کر پوچھا۔ "سنا ہے ڈارلنگ کہ حسین ساگر پر مخدوم صاحب بھی کچھ بولنے لگے ہیں اور آٹو گراف دینے لگے ہیں، یہ کہاں تک سچ ہے؟" تو کالج کی طالبہ نے آٹو گراف کے طور پر ایک زور دار تھپڑ رسید کیا۔ جس کے ساتھ ہی اس

www.taemeernews.com

نوجوان کو خدا یاد آگیا اور وہ بے ساختہ چیخ پڑا۔ "ربنا"۔

طالبہ نے کہا "آمین"!

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی!

فٹ پاتھ پر چلنے والے دوسرے نوجوانوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ وہ سڑک چھاپ فرہاد سڑک پر بیٹھا اپنے دائیں گال پر دیئے گئے اس سُرخی مائل آٹوگراف کو بُری طرح سہلا رہا تھا۔

جب یہ افواہ پیشہ ور عاملوں کے پاس پہنچی تو ایک مسلمان عامل نے ہندو عامل سے پوچھا:

"مہاشے! سُنا ہے کہ حسین ساگر پر مجسمے بولنے لگے ہیں! کیا یہ ممکن ہے کہ مجسمے بول سکیں"؟

ہندو عامل نے کہا۔ "حضور! یہ کون سا مشکل کام ہے؟ چھ کروڑ ناریل کا بندوبست کروادو۔ میں ابھی چل کر مجسموں کو ڈائیلاگ بولنے لگواؤں گا۔"

اس پر مسلمان عامل نے فرمایا "اچھا یہ بات ہے! تو پھر میں بھی مجسموں کو وجد میں لا سکتا ہوں۔ ہے کوئی عاقل جو چھ کنٹل عود، چھ کنٹل لوبان، چھتیس کنٹل پیور (PURE) گھی کا بندوبست کردے!"

چھ کا پہاڑہ پڑھتی ہوئی فہرست کو سُن کر ہندو عامل نے کہا۔ قبلہ! یہ فہرست وزنی ہے!

مسلمان عامل نے فرمایا "چھ کروڑ ناریل بھی بہت ہیں۔ تم ادھر ناریل کی تعداد کم کردو تو میں اِدھر اپنے میٹریل کا وزن بھی کم کردوں گا!"

ہندو عامل نے کہا۔ "قبلہ! یہ پروفیشنل جیلسی (PROFESSIONAL JEALOUSY) کچھ اچھی نہیں۔ ہم کو تو اتحاد اور یک جہتی سے کام کرنا چاہیئے! ورنہ دھندا بیٹھ جائے گا۔"!

www.taemeernews.com

اس ملی بھگت کو دیکھ کر ایک عقیدتمند وہیں بے ہوش ہو گیا۔

جب یہی بات ایک غافل نے دوسرے غافل سے پوچھی کہ میاں کیا یہ سچ ہے کہ حسین ساگر پر مجسمے بولنے لگے ہیں؟ تو دوسرے غافل نے پہلے غافل سے اُلٹا ہی سوال کر ڈالا۔ "کیا حسین ساگر پر مجسمے بھی ہیں؟"

یہی سوال جب ایک بے روزگار نوجوان سے پوچھا گیا تو وہ بولا "مجھے تو شہر میں کہیں بھی کوئی مجسمہ نظر نہیں آتا! مجھے تو ہر طرف نو ویکنسی (NO VACANCY) کے بورڈ نظر آتے ہیں۔ اگر کہیں کوئی ویکنسی (VACANCY) کا بورڈ نظر آئے اور مجھے ملازمت مل جائے تو شائد مجسموں کو دیکھ سکوں اور آرٹ کی قدر کرنا سیکھوں، سچ تو یہ ہے کہ پیٹ کی آگ آرٹ کے جذبہ کو بھسم کر کے رکھ دیتی ہے۔"

جب یہی سوال ایک مجسمے سے کیا گیا کہ کیا مجسمے بول سکتے ہیں؟ تو وہ مجسمہ بولا "کیا ہماری شامت آئی جو بات کریں!! اگر ہم بولنے لگ جائیں تو لوگ ہمیں زندہ سمجھ کر جان سے مار ڈالیں گے۔ نا بابا نا! ہمیں تو اپنا مجسمہ عزیز ہے!"

یہ افواہ گلیوں میں گردش کرتی، سڑکوں پر گھومتی، ٹریفک کو جام کرتی عوام کے نیتا شری ترشول کا پتہ پوچھتی ان کے محل نما جھونپڑے میں پہنچی، جہاں وہ اپنی ریوالونگ چیئر پر ٹانگیں پسارے براجمان تھے۔ ان کی نیم باز آنکھوں میں میر کے شعر کی اُس مستی کے علاوہ پُر تکلف ہیوی لنچ کی سُستی تھی۔ انھوں نے غنودگی کے عالم میں اپنے سکریٹری کو بلا کر سرکاری زبان میں پوچھا "کیا یہ خبر سچ ہے کہ حسین ساگر پر مجسمے بولنے لگے ہیں؟ ہمارا یہ خیال ہے کہ اس کے پیچھے ہمارے دشمنوں کا ہاتھ ہے اور یہ افواہ اپوزیشن والوں نے اڑائی ہے!"

سکریٹری نے کہا "حضور! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں! شائد آپ

www.taemeernews.com

بھول گئے ہیں کہ آپ ہی نے ارشاد فرمایا تھا کہ "ہمارے عوام کو کوئی کام نہیں ہے۔ بیکار بیٹھے بیٹھے بیانات جاری کرتے رہتے ہیں اور حکومت پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں لہٰذا ان کی توجہ کو ہٹانے اور مصروف رکھنے کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کر دینا چاہیئے۔ سو ہم نے مجسموں کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس افواہ کے پیچھے کسی اور کا نہیں ہمارا ہی ہاتھ ہے۔"

نیتا نے فرمایا "ٹھیک ہے۔ عاملہ اور انتظامیہ کو مصروف رکھنے کے لیے سیاست میں وقتی ملاوٹ تو ہونا ہی چاہیئے۔ ورنہ ایک ہی نوعیت کے کام سے بور ہو کر ملازمین ہماری ٹوہ میں لگے رہیں گے۔ اچھا تو یہ بتاؤ کہ اب اس افواہ کا حل کیا ہے؟"

سکریٹری نے جواب دیا "جب آپ نے ایک غلطی کی ہے تو پھر ایک اور غلطی بھی کیجئے! افواہ کا سارا الزام اقلیتوں کے سر تھوپ دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ ہمارے عوام اکثریت اور اقلیت کے مسئلہ پر کس بری طرح اُلجھ جاتے ہیں اور آپ کس خوش اسلوبی سے سُرخ رو ہوتے ہیں!"

سکریٹری کی یہ نامعقول تجویز نیتا کو بڑی معقول لگی۔ چنانچہ نیتا نے فوراً اکثریتی اور اقلیتی نمایندوں کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ جب سارے نمائندے جمع ہو چکے تو نیتا نے بھرے اجلاس میں یہ فرمایا کہ "سرکار بخوبی جانتی ہے کہ مجسموں کا افسانہ کس نے گھڑا ہے؟ سرکار کو جو خفیہ رپورٹ ملی ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ساری شرارت اقلیتوں کی ہے اور مجسموں کے بولنے کی افواہ ان ہی کی اُڑائی ہوئی ہے! آخر ہم بھی تو اپنی تیز رفتار گاڑی میں مجسموں کے پاس سے گزرے تھے۔ ہم نے کسی مجسمے کی آواز نہیں سنی۔"

یہ سُن کر اقلیتوں کے نمایندے شمشیر چوبی نے کہا "مسٹر ترشول! تم نے کس آسانی سے افواہ کا الزام اقلیتوں کے سر تھوپ دیا۔ یہ سراسر بہتان ہے، دشنام ہے۔ ویسے اقلیت کو موردِ الزام ٹھہرانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ سلسلہ تو مہابھارت سے چلا آرہا ہے

www.taemeernews.com

تم نے مہابھارت تو پڑھی ہو گی اور تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ کورو اکثریت میں تھے اور پانچ پانڈو اقلیت میں۔ یوں لگتا ہے کہ مہابھارت اب اپنے آپ کو دہرا رہی ہے"۔

ترشول نے چونک کر کہا "آخر ہم نے بھی تو مہابھارت پڑھی ہے۔ یہ اکثریت اور اقلیت کہاں لکھا ہوا ہے"؟

شمشیر چوبی نے کہا "پڑھنے کو تو طوطا مینا بھی پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کے ذہن کی کھڑکیاں تھوڑے ہی کھلتی ہیں! اس کے لیے تو بڑی گہرائی میں جانا پڑیگا اچھا تو خیر یہ بتاؤ کہ تم نے کس کی لکھی ہوئی مہابھارت پڑھ رکھی ہے"؟

یہ سنتے ہی نیتا بغلیں جھانکنے لگ گئے ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں کیوں کہ جب سے وہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھے تھے، پڑھنے پڑھانے کا سارا کام سکریٹری کے حوالے کر دیا تھا! انھیں یہ تک یاد نہیں رہا تھا کہ کون سے شاعر نے مہابھارت لکھی تھی۔ چنانچہ ان سے کچھ بن نہ پڑا تو بات کو ٹالنے کے لیے ایک غلط شاعر کا نام لیا۔

"ہم نے دیمتا کی لکھی ہوئی مہابھارت پڑھ رکھی ہے"!

شمشیر چوبی نے کہا۔ "دیمتا نے کوئی مہابھارت ہی نہیں لکھی"!

ترشول نے ذہن پر زور دے کر فرمایا "ارے ہاں، ہم نے غلط کہا۔ شاید رامنا کی لکھی ہوئی مہابھارت"!

شمشیر چوبی نے کہا "یہ بھی غلط"!

اس پر ترشول نے جھنجلا کر کہا "شاید اننتا کی لکھی ہوئی ....."!

شمشیر چوبی نے ہنس کر کہا "یہ اننتا کون ہے میرے آقا؟ خیر آقا اب جانے بھی دیجئے۔ یہ بحث اب یہیں رکھتے ہیں۔ جب آپ افواہ کا الزام تلیلو

www.taemeernews.com

نگاہیں چھپے ہیں تو چل کر مجسموں سے ہی پوچھ لیتے ہیں کہ خطا کس کی ہے؟ اور ان افواہ کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔؟ کیوں کہ اب ہمارے نیتا انصاف کرنے سے تو رہے۔"

ترشول نے حیرت سے کہا "کیا اس بات کی گواہی مجسمے دیں گے؟ کیا مجسمے بھی بول سکتے ہیں؟"

شمشیر چوبی نے کہا "جب نیتا اور اس کی سرکار سے انصاف کی توقع اُٹھ جاتی ہے تو مجسموں کو بولنے کے لیے مجبور ہونا ہی پڑتا ہے۔ مجسمے تو خیر پھر بھی مجسمے ہیں۔ جب بولنے پر آئیں تو عمارتیں بولتی ہیں۔ کھنڈرات بولتے ہیں۔ دیواریں بولتی ہیں۔ سناٹے بولتے ہیں۔ اور تو اور سننے کا اگر حوصلہ ہو تو پتھر بھی بولتے ہیں۔ اس پر بھی اگر بات سمجھ میں نہ آئے تو اجنتا اور ایلورہ کے غاروں کے درشن ٹی اے (T.A) اور ڈی۔ اے (D.A) کلیم (CLAIM) کیئے بغیر اپنے ذاتی خرچ پر جاکر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آرٹ کس طرح بولتا ہے اور سچائی کس طرح بولتی ہے!؟

چونکہ اب بات اقتدار کی نہیں بلکہ نیتا کے شخصی وقار کا مسئلہ بن گئی تھی، وہ مجسموں کے درشن کے لیے راضی ہو گئے۔ یوں بھی اجلاس والے بحث و مباحثہ کے بعد ان کا تھوڑا سا برین واش (BRAIN WASH) بھی ہو چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے نمایندوں کا اجلاس برخاست کیا۔ وہاں سے وہ سیدھے باتھ روم کی طرف چلے۔ سیاست کا لبادہ اتار پھینکا اور نیتا سے جوگی کا روپ دھارنے کے لیے ٹب میں غوطے پر غوطہ اتنے غوطے لگائے کہ نزلے کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ٹب سے برآمد ہوئے۔ میک اپ مین کو بلایا۔ تن پر بھبھوت ملا۔ بائیں کان میں زمرد کی بالی پہنی۔ زری پاٹ کا ایک لنگا پہننے کا ارادہ کر ہی رہے

www.taemeernews.com

تھے کہ میک اپ مین نے ٹوکا:

"حضور یہ آپ کیا کر رہے ہیں! لنگا تو صرف جوگنیں پہنتی ہیں۔"

نیتا نے میک اپ مین کو ڈانٹ کر کہا "کیا تو ہماری دھرم پتنی ہے جو مشورہ دے رہا ہے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، آج نیتی میں نقلی ہٹ دھرمی کی بنا پر کر رہے ہیں۔"

یہ سن کر میک اپ مین خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد نیتا نے میک اپ مین سے نظریں بچا کر لہنگے کو الگ کیا۔ گیروے کپڑے زیب تن کیے۔ سر پر جٹا والی وگ لگائی۔ آنکھوں میں اس قدر سرمہ بھر کر لگا تھا کہ نیتا نہیں، سرمہ کا ڈنڈا [illegible] لگ رہا ہے۔ سرمہ سے فرصت ملی تو گلے میں مالائیں پہنیں۔ ہاتھ میں ایک کمنڈل سنبھالی۔ پاؤں میں کھڑاویں پہنے۔ لیکن پریکٹس نہ ہونے کی وجہ سے بُری طرح لڑکھڑا گئے اور لنگڑی چال چلنے لگے۔ پھر اس کے بعد قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر چلنے اور ڈائیلاگ بولنے کی ریہرسل کی۔ جب وہ پوری طرح سے بن سنور کر ہر طرح سے مطمئن ہو کر باہر نکلے تو شمشیر چوبی نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا "حضور! آپ کا اصلی روپ بالکل سامنے آ گیا ہے اور یہ روپ کتنا حقیقی لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ چٹاپٹ دو چار بوسے لے لوں۔"

نیتا نے شمشیر چوبی کے منہ سے تعریف سنی تو کہا "یہ آپ کیا فرماتے ہیں! خواہ مخواہ شرمندہ کرتے ہیں!"

شمشیر چوبی نے کہا "معاف کرنا پربھو! ابھی شرمندگی کا مقام کہاں سے آیا ہے! شرمندگی کے مقامات تو آگے آئیں گے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!"

نیتا سے جوگی بن کر شری ترشول نے چین ساگر کی راہ لی۔ تھوڑی دور تک چلنے

www.taemeernews.com

کے بعد شمشیر چوبی نے چھوٹی ضرورت کا بہانا بنایا اور ترشول سے اجازت لے کر بلدیہ کے یوریئل کی طرف چل پڑا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اتنے میں اچانک بجلی فیل ہو گئی۔ شاید بتیا کو آتا دیکھ کر وہ بھی روٹھ گئی تھی۔ ہر طرف پر ہول سناٹا تھا۔ یکایک نیت! کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر واقعی مجسمے بولنے لگ جائیں تو سارا پول کھول کر رکھ دیں گے اس خوف نے ان کی انتر آتما کو بیدار کیا۔ چنانچہ ان کی آنکھوں سے تنگ نظری کا پردہ ہٹ گیا۔ سب سے پہلے ترشول "تلگو تلی" کے مجسمے کے پاس پہنچے اور بڑے احترام سے "تلگو تلی"[1] کو پرنام کیے۔ وہاں سے تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے جب ترشول نے مخدوم صاحب کے مجسمے کو پار کیا تو آواز آئی :

" ہیلو مسٹر ترشول! ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

اس طرز تخاطب پر ترشول نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟ اور یہ کیا فرمارہے ہیں؟" آواز آئی "نہیں پہچانا! میں "اردو تلی" بول رہا ہوں! ارے بھئی میں مخدوم ہوں مخدوم — "سرخ سویرا" کا خالق! کیا وزیٹنگ کارڈ پیش کرنا پڑے گا؟ مجھے حیرت ہے کہ تم نے صرف "تلگو تلی" کو یاد رکھا اور "اردو تلی"[2] کو بھول گئے جو دل سے سارے دیش کی تلی تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض مفاد پرست زبان سے اس کا اقرار نہیں کرتے!

ترشول نے کہا۔ "اب میں کتنی "تلیوں" کو یاد رکھوں؟ ہمارے دیش کی زبانیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ زبان اور بولیوں کی کثرت میں ہم کس "تلی" کا خیال رکھیں اور کس تلی کو شاد کریں۔

مخدوم بولے "یہی" تو ہمارے ملک کی خوبی ہے۔ بولیوں اور بھاشاؤں کی کثرت

---

[1] تلگو ماں [2] اردو ماں

www.taemeernews.com

میں وحدت کو تلاش کرنا ہوگا۔ اور بھانت بھانت کے پھولوں سے ایک ایسی مالا بنانا پڑے گا جس سے ملک کی شوبھا بڑھے۔ جمہوریت میں یہی تو کرنا پڑتا ہے

ترشول نے کہا یہ تو ٹھیک ہے! لیکن میں کثرت میں وحدت کی تلاش میں لگ جاؤں تو پھر میری اولاد کی کثرت کا کیا ہوگا اور ان کے مستقبل کا کیا بنے گا۔ اب رہا دیش کی اچھائی کا معاملہ، تو اس موقع پر مجھے تمہارا ایک شعر یاد آرہا ہے سنو:

ع سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا

مخدوم نے ہنس کر کہا کس کا کلام کسے سنا رہے ہو؟ یہ تو اقبال کا کلام ہے۔ اور ابھی تم نے جو پڑھا ہے وہ شعر نہیں، مصرع ہے"۔

ترشول نے جھینپ کر کہا "ارے ہوگا بھی مصرع! اس سے کیا فرق پڑتا ہے"؟

مخدوم نے اصرار کے ساتھ کہا "ہوگا نہیں، ہے! پہلے تم اپنی اصلاح کر لو! یہ کوئی الیکشن کی تقریر یا انتخابی منشور نہیں کہ جو چاہا کہہ دیا اور جو جی میں آیا پڑھ ڈالا پھر مکر گئے۔ یہ شاعری ہے میاں شاعری! یہاں غلط تاویلات پر سند چھین لی جاتی ہے۔ یونیورسٹی کی عطا کردہ ڈگری کو واپس کرنا پڑتا ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ جب تم یہاں تک آ ہی گئے ہو تو ذرا آگے بڑھ کر سری کرشن دیورائے سے بھی مل آؤ میں اس وقت تک شاعرے کا انتظام کرتا ہوں۔ دلی میں ایک بار "چاندنی چوک کا کھڑا مشاعرہ" برپا کیا تھا لیکن آج حسین ساگر کا کھڑا مشاعرہ" برپا کرنا چاہتا ہوں جو ہمہ لسانی ہوگا!"

مخدوم کے پاس سے نکل کر مسٹر ترشول سری کرشن دیورائے کے مجسمے کے پاس پہنچے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ اتنے میں آواز آئی "بتاؤ اب تمہارے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا جائے"؟

ترشول نے کہا وہی جو ایک راجہ دوسرے راجہ کے ساتھ کرتا ہے!

www.taemeernews.com

کرشن دیورائے نے پوچھا "یہ ڈائیلاگ کس فلم کے ہیں اور ڈائیلاگ رائٹر کون ہے؟"

ترشول نے کہا "میں خود اب ایک فلم ڈائرکٹ کر رہا ہوں۔ میں کلاکار بھی ہوں اور کلا پریمی بھی! اور فائن آرٹس کی قدر کرنا بھی جانتا ہوں!"

کرشن دیورائے بولے "اگر تم سچے کلاکار اور کلا پریمی ہوتے اور فنونِ لطیفہ کی قدر کرنا جانتے تو پھر اپنی سرکار سے "آستھانہ کوی" کا عہدہ برخاست نہ کرتے اور "ملک الشعرا" کا خطاب چھین نہ لیتے۔ آخر ہم نے بھی کبھی حکومت کی تھی۔ ہم بھی کلاکار اور کلا پریمی تھے۔ ہمارے دربار سے شاعر ادیب اور فن کار وابستہ تھے۔ ہم راجہ راجہ مہاراجہ ہونے کے باوجود بھی اپنے دربار کے شاعر اَلاّ ساتی پدّنا کے پیر میں اپنے مبارک ہاتھوں سے ایک یادگار اعزازی کڑا پہنایا۔ یہی نہیں پدّنا کو پالکی میں بٹھا کر بنفسِ نفیس پالکی کو اٹھایا اور شہر میں پورے اعزاز کے ساتھ گشت کروایا اور وجے نگر کی جنتا کو یہ دکھا دیا کہ کلاکار کی کس طرح عزت کی جاتی ہے؟ ایک تم ہو کہ شاعر کو پالکی میں گشت کروانا تو کجا سیکل پر تک گشت نہیں کرواتے، چاہے ڈبل سواری ہی کیوں نہ ہو۔ تم سے کوئی ملنے کے لیے آتا ہے تو تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے قدم چومے۔ جمہوریت میں خر یہ چوما چاٹی کب تک؟ — کیا سیاست میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

ترشول نے سری کرشن دیورائے سے یہ کھری کھری سُنی تو ان کا سیاسی خمار کچھ اُتر گیا لیکن انھیں ابھی بہت سارے مجسموں سے ملاقات کرنی تھی۔ چنانچہ وہ وہاں سے دیمنا کوی کی طرف چل پڑے! ابھی وہ مجسمے کے قریب پہنچ بھی نہیں پائے تھے کہ ایک کہی کہی آواز سنائی دی:

اور آگے مت بڑھو! میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے یہاں جس انداز میں جس پوزیشن اور پوز میں بٹھا دیا گیا ہے، وہ مجھے قطعی پسند نہیں ہے۔ میں تمہیں شراپ

www.taemeernews.com

دوں گا!"

ترشول نے گھبرا کر کہا "گرو جی! ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ شما کیجیے اور عوام کے لیے کوئی پیام دیجیے؟"

دیمنا نے خفگی سے کہا "میں پیام دیام کچھ نہیں دینا چاہتا۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ حسین ساگر میں کیکڑے بہت زیادہ ہو گئے ہیں اور مچھلیوں کو کتر کتر کر کھا رہے ہیں۔"

ترشول کو یہ جملہ ایک علامتی کہانی کا سا لگا۔ وہ ابھی اس کے مفہوم پر غور کر ہی رہے تھے کہ گشت کو نکلا ہوا ایک پولیس والا اُدھر آ نکلا۔ اس نے نتیا کو جوگی کے روپ میں دیکھ کر پوچھا:

"تم کون ہو؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ترشول نے گمبھیر لہجے میں کہا "نہیں پہچانا! میں شہریار ہوں!"

پولیس والے نے پوچھا "تمہارا نمبر کون سا ہے؟ میں اب تک دو شہریار سے مل چکا ہوں!"

ترشول نے گرجدار آواز میں کہا "نالائق اتنا بھی نہیں جانتا کہ میں اس شہر کا حاکم ہوں۔ اور شہر کے حالات جاننے کے لیے بھیس بدل کر نکلا ہوں۔ کیا تو نے ناکے میں میری تصویر نہیں دیکھی؟"

پولیس والا بولا "ناکے میں جیب کتروں کی تصویریں بھی تو ہوتی ہیں!"

یہ سن کر ترشول نے اپنا میک اپ اُتارا۔ جوں ہی پولیس والے کی نظر ترشول کے اصلی چہرے پر پڑی تو اس نے اٹینشن ہو کر جھٹ سے سیلوٹ کیا۔

پولیس والے کا سیلوٹ لے کر نتیا اپنے محل نما جھونپڑے کی طرف روانہ ہوئے۔ بھوتوں سے بھینٹ کے بعد ان کی آتما کسی قدر جاگ چکی تھی۔ راستے میں وہ

www.taemeernews.com

سوچنے لگے کہ راج نیتی بھی کتنی فالتو چیز ہے اور اس میں کیسی کیسی دھاندلیاں کرنی پڑتی ہیں۔ لہٰذا سنیاس لے لینا چاہیئے۔ جھونپڑے کو سینچنے کے بعد ان کو بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ شمشیر چوبی کا پُر اسرار طور پر غائب ہو جانا ان کے لیے ایک معمّہ بنا ہوا تھا۔

دوسرے روز جب پریس رپورٹر زان سے ملاقات کے لیے پہنچے اور مجھول کے حوالے سے حقیقت دریافت کرنا چاہی تو نیتا نے اس واقعہ سے صاف انکار کر دیا اور انتہائی بے رخی و برہمی کے لہجے میں فرمایا کہ "ہمارا پریس نہایت ہی غیر ذمہ دار ہے اور وہ غیر غلط خبروں کو جلی حروف میں چھاپ کر نیتا اور اس کی سرکار کو بدنام کرتا رہتا ہے"!

■■

www.taemeernews.com

بَیتُ الخیال

عنوان پڑھ کر شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ بیت الخیال کسی شاعر کے مجموعۂ کلام یا اس کے 'غریب خانہ' کا نام ہوگا۔ جی نہیں! یہ صرف آپ کا خیال ہی خیال ہے۔ یہاں "بیتُ الخیال" سے ہماری مُراد اپنے گھر کی وہ مختصر سی چوُ دِلواری ہے جسے ہم نے بزعم خود ادیب ہونے کے ناتے یہ نام دے رکھا ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہمارے بیتُ الخیال کی کل کائنات صرف دو قدمچے ہیں۔ ویسے، ہر بیت الخیال کی کُل کائنات صرف دو قدمچے ہوا کرتی ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ بعض لوگ اسے ریڈنگ روم، ڈرائنگ روم، ویٹنگ روم ــــ اور نہ جانے کیا کیا 'روم' کا درجہ دے دیتے ہیں اور کن کن اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ زمانہ ملٹی پرپز پراجکٹ کا ہے اور آج کا انسان ایک چیز سے کئی مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ فلموں میں اُسی ایکٹرس کو زیادہ چانس دیا جاتا ہے جو کئی طرح کے رول کر سکتی ہو اور کئی طرح سے کام آتی ہو۔

آپ ہماری اس بات سے ضرور اتفاق کریں گے کہ بیتُ الخیال ہی مکان کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہر شخص کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب وہ وہاں سے فراغت پا کر نکلتا ہے تو بالکل چاق وچوبند

www.taemeernews.com

دکھائی دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد دیکھئے کہ شام تک اس کے چہرے پر کس غضب کی "بحالی" رقص کرتی رہتی ہے۔ سارے کاروبار بڑی خوش اسلوبی سے انجام پاتے ہیں۔ نہ کوئی اڑچن اور نہ کوئی رکاوٹ۔ بلڈ پریشر بھی بالکل نارمل رہتا ہے مُسکرا مسکرا کر بات کو بھی چبا جاتا ہے۔ اگر کوئی آئی اے ایس آفیسر یا گزیٹیڈ آفیسر کسی دن اپنے ماتحتوں سے مُسکرا مسکرا کر بات کرے تو سمجھ لیجئے کہ وہ اس دن اپنے "بیت الخیال" سے نہایت "بیابان" کامرانی کے ساتھ برآمد ہوا ہے۔

لیکن شاعروں، ادیبوں اور مفکّروں کی بات بالکل جُداگانہ نوعیت کی ہے۔ کیوں کہ مختلف موضوعات پر گھنٹوں سوچنا اور غور و فکر کرنا ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اور غور و فکر کے لیے "بیتُ الخیال" سے زیادہ موزوں جگہ شاید ہی کہیں ہو۔ کیوں کہ آجکل کے مکانوں میں "خلوت" نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی جہاں آپ تنہا کسی موضوع پر غور و فکر کرسکیں اور آپ کو ڈسٹرب کرنے والا کوئی نہ ہو۔ شہر کے پارک، چمن اور تفریح گاہ بھی اس قابل نہیں رہے جہاں آپ کو گوشہ تنہائی نصیب ہوسکے۔ گوشہ تنہائی کی تلاش میں جب آپ گھر سے بیزار ہوکر کسی پارک یا چمن کا رُخ کرتے ہیں تو وہاں آپکے پالش والا، مالش والا، تیل والا کے علاوہ مال والا قسم کے بیسیوں دلّالوں اور بروکروں سے سابقہ پڑتا ہے۔ یُوں بھی آج کل کے چمن، پارک اور تفریح گاہ OPEN-AIR-URINAL اور LAVATORY میں تبدیل ہو گئے ہیں جہاں جگہ کی قلّت کا شکار ہونے والے لوگ مختلف پوزیں مختلف ضروریات سے فارغ ہوتے نظر آتے ہیں۔ اب لے دے کر "بیتُ الخیال" ہی غور و فکر کے لیے موزوں و مناسب جگہ قرار پاتی ہے۔

چنانچہ جب ادیب، شاعر اور مفکّر اپنے "بیتُ الخیال" میں بند ہو جاتے ہیں تو

www.taemeernews.com

اُن کے ذہن کی کھڑکیاں روشن دان اور دروازے یکے بعد دیگرے آہستہ آہستہ کھلنے لگتے ہیں۔ چہرے پر ایک رنگ آتا ہے، ایک رنگ جاتا ہے۔ غیب سے مضامین آنے لگتے ہیں۔ اسرار و رموز کھلنے لگتے ہیں۔ خرد کی گتھیاں سلجھنے لگتی ہیں۔ ایک خیال آتا ہے، ایک خیال جاتا ہے۔ دُھندلا خیال واضح خیال کا رُوپ اختیار کرتا ہے۔ روشن خیال ایک اچھوتے خیال میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی ادیب یا شاعر یا مفکّر "بیتُ الخیال" میں طویل قیام فرمائے تو یقین کر لیجئے کہ وہ کچھ اسی قسم کے خیالات میں غلطاں و پیچاں ہے۔ چچا غالب نے انسان کے محشرِ خیال ہونے کی جو بات کہی ہے شاید وہ فیضانِ بیت الخیال ہی کا نتیجہ ہو۔ ازار بند میں گرہیں لگانے کی بات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے شاید مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" مرتب کرتے وقت ازراہ اُستاد نوازی رعایت و مروّت سے کام لیا ہو۔ اس سلسلے میں محققین کو چاہیئے کہ وہ "بیتُ الخیال" میں بیٹھ کر غور کریں۔ کیوں کہ غور و فکر اور یکسوئی کے لیے "بیتُ الخیال" سے زیادہ موزوں جگہ شاید ہی ہو۔!

CONTRI-BUTION
ہمارا لٹریچر "بیتُ الخیال" کے ذِکر سے خالی پڑا ہے۔ کسی نے بھی اس کے CONTRIBUTION کی جانب توجہ نہیں دی۔ ہو سکتا ہے ادب کو نازک اور اچھوتے خیالات سے مالا مال کرنے میں "بیتُ الخیال" کا بہت بڑا CONTRIBUTION رہا ہو۔ کتنے ہی ایسے اچھوتے اور نازک خیالات ہوں گے جنھیں شعرا نے "بیتُ الخیال" سے نکلنے کے بعد اشعار میں ڈھالا ہو اور پھر بعد میں انھیں ایوانوں اور قریوں میں سجایا گیا ہو۔ کتنی ہی ایسی تصویریاں ہوں گی جو "بیتُ الخیال" میں جنم لی ہوں اور پھر اس کے بعد انقلاب کا ذریعہ بنی ہوں۔ دُور کیوں جائیے، مشہور سائنس داں نیوٹن نے کششِ ثقل کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ "بیتُ الخیال"

www.taemeernews.com

کے فیضان ہی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نیوٹن کے زمانے میں "بیت الخیال" باغ کی نوعیت کا رہا ہو۔ ہماری اس بات پر ہو سکتا ہے محققین اور مؤرخین چراغ پا ہو جائیں اور از سرِ نو تحقیق کر کے باغ کو "بیت الخلاء" ثابت کر دیں۔ کیوں کہ محققین اور مؤرخین کے لیے باغ میں بیٹھے ہوئے شخص کو بیت الخلاء میں بٹھانا اور بیت الخلاء میں بیٹھے ہوئے شخص کو باغ میں بٹھانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اور آج کل یہ کام ہمارے مؤرخین اور محققین بڑے دھڑلے سے انجام دے رہے ہیں۔

یہ بڑا عجیب و غریب نفسیاتی معاملہ ہے کہ غسل خانے میں نغمے گانے سوجھتے ہیں اور گنگنانے کو جی چاہتا ہے ـــ لیکن "بیت الخیال" میں یہ ساری سرگرمیاں بالکل معیوب سمجھی جاتی ہیں اور اس کا مرتکب پاگل قرار پاتا ہے۔ یوں بھی "بیت الخیال" میں داخل ہونے کے بعد انسان کو ایک چُپ سی لگ جاتی ہے۔ اور اس پر گمبھیرتا طاری ہو جاتی ہے آپ کو یوں معلوم ہو گا جیسے سارا علاقہ ایک SENSITIVE AREA قرار دیا گیا ہو مفکرین نے اس علاقہ کو 'SILENCE ZONE' قرار دیا ہے اور مجبوری کی صورت میں صرف ایک گمبھیر "ہوں" کے ذریعہ اپنا اَتا پتا بتانے کی اجازت دی ہے بعض شرمیلے قسم کے لوگ تو اس حد تک آداب ملحوظ رکھتے ہیں کہ "ہوں" کہنا تک گوارہ نہیں کرتے بلکہ مصنوعی کھانسی کے ذریعہ اپنی موجودگی سے مطلع فرماتے ہیں۔

جب ہم کسی اہم مسئلہ سے دوچار ہو جاتے ہیں تو اس کو "بیت الخیال" سے رجوع کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں "بیت الخیال" سے کوئی خاص اُنس ہے۔ دراصل ہم جگہ کی قلت کا شکار ہیں۔ ہمارے گھر میں کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جہاں صرف ہم ہی ہم ہوں اور ہمارے خیالات ہوں۔ ہمارے کمرے میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ ہمارے ساتھ خیالات بھی سما سکیں۔ ہمارے شہر کے پارک اور چمن اس قابل

www.taemeernews.com

نہیں رہے کہ وہاں گوشۂ تنہائی نصیب ہو سکے۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ وہاں پالش والوں، مالش والوں، بھیک مانگنے والوں، آنکھ چُرانے والوں آنکھ ملانے والوں اور آنکھ مارنے والوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اب لے دے کر "بیتُ الخیال" ہی وہ واحد جگہ رہ جاتی ہے جہاں کوئی کسی کو ڈسٹرب نہیں کرتا چنانچہ جب ہم کسی اہم موضوع کو لے کر بیتُ الخیال کا رُخ کرتے ہیں تو گھر والوں کو وارننگ دے دیتے ہیں کہ دیکھو بھئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرنا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیتے ہیں کہ اگر کوئی ہمارے بارے میں پوچھے تو صاف کہہ دینا کہ ہم گھر میں نہیں ہیں۔

اشارے اور کنائے برطرف! ہم لکھنا چاہتے تھے "بیت الخلاء" لیکن لکھ گئے "بیت الخیال" لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ سوچ اگر اچھی ہو، خیالات اگر اچھے ہوں تو کیا بیت الخلاء اور کیا بیت الخیال۔ یوں اگر غور کریں تو "بیت الخیال" انسانی ذہن کا دوسرا نام بھی ہے بشرطیکہ اس میں اچھے خیالات پرورش پاتے ہوں اور وہ صالح ادب کی نکاسی کرتا ہو اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو "بیت الخیال" ہی "بیت الخلاء" بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح کی کئی زندہ مثالیں آج دنیا میں موجود ہیں۔ فی الحال ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

بدنامِ زمانہ مصنّف سلمان رشدی نے "THE SATANIC VERSES" (شیطانی کلمات) لکھی اور دولت کے ساتھ ساتھ رسوائی بھی خوب کمائی۔ اب آپ ہی سوچئے کہ صاحبِ معتوب کی یہ تصنیف "بیت الخلاء" کی پیداوار ہے یا "بیت الخیال" کی؟!

---

www.taemeernews.com

بوریا ٹاکیز کی یاد میں

میں جب کبھی "نیاپُل" کے پاس سے گزرتا ہوں تو مجھے اپنے لڑکپن کے زمانے کی ایک ٹاکیز جسے ہم "بوریا ٹاکیز" کہا کرتے تھے، بے ساختہ یاد آنے لگتی ہے۔

"نیاپُل" کے پاس کی ٹاکیز اُجڑی، بسی اور پھر پکچر ہاؤز سے "فنکشن ہال" میں تبدیل ہوگئی لیکن میرے لڑکپن کے دَور کی ٹاکیز کا انجام اس کے بالکل برعکس ہوا۔ وہ جو اُجڑی تو بس اُجڑتی ہی چلی گئی۔ اور بالآخر "مرحوم و مغفور" ہوگئی۔ اب اس کی جگہ ایک پارٹی آفس قائم ہے جہاں آئے دن سیاسی دلال اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔

یوں تو ہم نے اپنی زندگی میں کئی ٹاکیزوں کو بنتے، بگڑتے، ٹوٹتے اور سنورتے دیکھا اور بھگتا بھی ہے۔ لیکن "بوریا ٹاکیز" کی سی بات کسی میں نہ آسکی۔ وہ آج بھی ہمارے دل کے محافظ خانے میں جوں کی توں آلگی ہے۔ کیوں کہ ہم نے پہلی بار پہلی فلم دیکھنے کے لیے "بوریا ٹاکیز" ہی کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا تھا۔ اور آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ پہلا پیار یا پہلا عشق جس کے اظہار پر خوب جوتے پڑے ہوں، بھلایا نہیں جاسکتا۔ ویسے، وہ عشق ہی کیا جس میں پٹائی نہ ہو؟ وہ پیار ہی کیا جس میں کھانے کو گالیاں نہ ملیں؟ وہ عاشق ہی کیا جو اپنی عزت و آبرو بچالائے؟ اسی قسم یا اس سے ملتی جلتی صورتِ حال سے ہمیں بھی دو چار ہونا پڑا تھا جب کہ ہم نے پہلی بار پہلی فلم دیکھنے کے لیے "بوریا ٹاکیز" کے احاطہ میں بڑے ارمانوں سے قدم رکھا تھا۔ یہ قصہ

www.taemeernews.com

تو بڑا دردناک، عبرت ناک اور نہ جانے کیا کیا "ناک" ہے جس میں ہماری ناک کے کٹنے کا احتمال ہے۔ فی الحال اس قصہ کو یہاں چھوڑتے ہیں اور "بوریا ٹاکیز" کو ذرا یاد کر لیتے ہیں۔

"بوریا ٹاکیز" واقعی بوریا ٹاکیز تھی جسے ایک چہار دیواری کے اندر بانس کی ٹٹیوں سے گھیر کر بنایا گیا تھا۔ اس کی چھت بھی ٹٹیوں کی مرہونِ منت تھی جس میں جگہ جگہ کبوتروں نے موقع ومحل کی مناسبت سے گھونسلے بنا لیے تھے۔ جو ناظرین ان گھونسلوں کی عین سیدھ میں تشریف رکھتے ان کی چندیا کبوتروں کے بول و براز کا نشانہ بنتی تھی۔ اس راز سے صرف "مدامی ناظرین" واقف تھے۔ اب آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ نئے ناظرین کی کیا درگت بنتی تھی ـــــ کبوتروں کی ساری بیٹ انھیں کے حصہ میں آتی تھی۔

صرف ٹاکیز کی چہار دیواری کا گیٹ مضبوط تھا جو دن میں بند رکھا جاتا تھا۔ جسے وہاں سے گزرنے والا ہر لڑکا دھپا دھپ پیٹ کر اپنے انتقام کی آگ بجھا لیا کرتا تھا بعض مہم پسند لڑکے تو دن کے وقت چہار دیواری پھاند کر اندر جاتے اور تھیٹر کی دیوار نما ٹٹی میں حسبِ توفیق سوراخ بنا آتے تاکہ مناسب موقع پر اس سے استفادہ کر سکیں۔ ہم نے بھی اپنے قد کی مناسبت سے حسبِ حیثیت اس ٹٹی میں ایک سوراخ بنایا تھا تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

اس ٹاکیز کا ایک بھلا سا نام ضرور تھا جو اس کی خصوصیات کے پس منظر میں کہیں چلا گیا تھا۔ لوگ اسے "بوریا ٹاکیز" کے نام سے ہی پکارا کرتے تھے۔ ٹٹیوں کو کاٹ کر تین الگ الگ درجے بنائے گئے تھے جن میں دروازہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ البتہ ہر درجہ کے گیٹ پر ایک سیاہ پردہ لٹکا دیا گیا تھا جس سے دروازے کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

پہلا درجہ جو اسکرین کے بالکل سامنے تھا "تھرڈ کلاس" کہلاتا تھا جس کا ٹکٹ چار آنے تھا۔ تھرڈ کلاس کو تھرڈ کلاس ہی رکھا گیا تھا جو ہر قسم کے تکلف سے عاری

www.taemeernews.com

تھا۔ فرش تک خاکی تھا جس پر روزانہ بالالتزام گوبر کا چھڑکاؤ ہوتا۔ اس گوبری فرش پر ہم جیسے ناظرین با تمکین یہ سوچ کر بیٹھ جاتے کہ "ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے" اور خوش بھی بہت ہوتے۔ نزاکت پسند ناظرین کچھ دیر تک تو تکلف میں اکڑوں بیٹھتے اور جیسے ہی ان کی ٹانگیں جواب دینے لگتیں، راہِ راست پر آجاتے۔ یعنی آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ لیکن بعض نزاکت پسند ناظرین ہال میں اندھیرا ہونے کے بعد ہی راہِ راست پر آنا مناسب تصور کرتے۔ اور جن ناظرین کو اپنے پاجامے اور پتلون کا خیال رکھنا ہوتا وہ اپنے ساتھ سب حیثیت ٹاٹ یا رومال رکھتے۔ اور جو ناظرین باجماعت فلم دیکھنے کے عادی ہوتے وہ اپنے ساتھ شطرنجی لاتے جو شکر رنجی کا سبب بنتی۔

البتہ "سکنڈ کلاس" میں بنچوں کا اہتمام تھا۔ لیکن ان بنچوں میں سے اکثر کی چولیں ڈھیلی ہوگئی تھیں جن میں کھٹملوں نے بود و باش اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ کھٹملوں کے کاٹنے پر جب ناظرین پہلو بدلنے لگتے تو بنچ کشتی کی طرح ڈولنے لگتی تھی۔ بعض بنچوں کے تختے تو اس حد تک ڈھیلے ہوگئے تھے کہ ناظرین کے ذرا سا ہلنے پر قینچی کی بلیڈوں کی طرح کام کر کے متنبہ کیا کرتے کہ خبردار اب جو بھی ہلے گا اس کی رانوں کی خیر نہ ہوگی۔ بنچوں کی ان خصوصیات سے صرف "مدامی ناظرین" واقف تھے جو بیٹھتے وقت احتیاط سے کام لیتے۔ البتہ نئے نویلے ناظرین بنچوں کی کارستانیوں کے نشان، شو (Show) کے اختتام پر اپنے پاجامے یا پتلون یا جسم کے ناقابلِ بیان حصوں پر یادگار کے طور پر لے جاتے۔

آخری درجہ جو سب سے پیچھے تھا، خواتین کے لیے مختص تھا۔ زنانہ گیٹ کی گیٹ کیپر "بھولی زنانہ" تھی جو اپنے سخت رویّہ کی وجہ سے بدنامی کی حد تک مشہور تھی۔ خود تو پردہ کی پابند نہیں تھی۔ البتہ فلم دیکھنے آنے والی خواتین کو پردہ کی

www.taemeernews.com

سخت تلقین کیا کرتی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ اس کی مثال ایک کلال کی سی تھی جو خود تو نہیں پیتا البتہ گاہکوں کو بہ اصرار پلاتا ہے۔ اس کی سختی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی دوشیزہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اِدھر اُدھر جھانکنے لگتی تو وہ اس کو بری طرح ڈانٹ دیتی۔

"کیوں جی بی بی! کیا تمہارے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے؟"

اُس کے اس سخت گیر رویّہ کی وجہ سے لوگ اِسے "ڈائن" کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کی موجودگی میں کسی مَرد کی یہ ہمت نہ ہوتی کہ وہ زنانہ گیٹ تک جائے اور کسی خاتون سے بات کرے۔ اور نہ کوئی خاتون، مردانہ تک جا کر اپنے شوہر نامدار سے بات کرنے کی جراءت کرسکتی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ بیولوں سے بیزار رہنے والے شوہر اپنی بیویوں کو زنانہ گیٹ پر چھوڑ کر سکون کا سانس لیتے کہ چلو تین چار گھنٹوں کے لئے ہی سہی، بیویوں سے چھٹکارا تو ملا۔ زنانہ اور مردانہ کے درمیان تھوڑا سا گیپ (GAP) تھا، جو "NO MAN LAND" (نو مین لینڈ) کی تعریف میں آتا تھا۔ اور اس کے بیچوں بیچ ایک پردہ حائل رہتا تھا جو پکچر کے آغاز پر ہال میں اندھیرا ہونے پر ہی ہٹا دیا جاتا تھا۔ اور پھر روشنی ہونے پر کھینچ دیا جاتا تھا۔ لہٰذا آنکھیں لڑ جانے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بعض بوالہوس قسم کے ناظرین "وقفہ" کے وقت وقفہ وقفہ سے زنانہ کی طرف کچھ اس طرح دیکھتے جیسے سلام پھیر رہے ہوں۔ اُس زمانے میں یہ فقرہ "ارے پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے؟" (پتہ نہیں کس فلم کا تھا) خوب چلتا تھا۔ ہال میں جب کوئی نوجوان پلٹ کر زنانہ کی طرف دیکھتا تو کوئی نہ کوئی منچلا یہ فقرہ چلا دیتا:

"ارے پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے"؟

www.taemeernews.com

اکثر اوقات تو یہ فقرہ چل جاتا لیکن کبھی کبھار اس فقرہ کا منہ توڑ جواب اسی بحر اور اسی وزن میں مل جاتا: "فلاں بنتِ فلاں کی طرف ہے"۔ اس کے ساتھ ہی جوتا بھی چل جاتا تھا۔ روزانہ صرف دو شو ہوا کرتے تھے۔ فرسٹ شو مغرب کے بعد شروع ہوتا تھا تاکہ "نمازی ناظرین" کی نماز قضا نہ ہو پائے۔ سکنڈ شو رات کے دس بجے شروع ہوتا تھا۔

خدا گواہ ہے کہ "بوریا ٹاکیز" میں کبھی بھی کوئی نئی فلم نہیں دکھائی جاتی تھی۔ پرانی سے پرانی فلم "برانڈ نیو پرنٹ" کے عنوان سے دکھائی جاتی جو ہر شو کے دوران کم از کم دس پندرہ مرتبہ ٹوٹتی یا کٹتی تھی۔ اور جیسے ہی فلم کٹ جاتی تو پردہ پر یہ دکھایا جاتا کہ "ریل بدلا جا رہا ہے"۔ اور پھر ہال میں روشنی کر دی جاتی۔ "بوریا ٹاکیز" کے مینجر کو کبھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ کسی مستند لغت سے رجوع کر کے "ریل" کی جنس کا پتہ لگائے۔

اب ذرا جگر تھام کر بیٹھیے کہ ہم اپنی زندگی کا وہ باب الٹنے جا رہے ہیں جس میں پردہ نشینوں کے نام تو نہیں آئیں گے۔ البتہ "بوریا ٹاکیز" اور اس کی کینٹین کے ایک بیرے اور ہمارے اور بیرے کے ایک مشترکہ دوست پاشا بھائی کا ذکر خیر تو نہیں، ذکر شر ملے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے شوقِ فلم بینی کو ہوا دینے کے ذمہ دار پاشا بھائی ہی تھے۔ وہ ہر روز ہمیں نت نئی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے ایکٹنگ کے ساتھ سناتے اور ہماری آتشِ شوق کو بھڑکاتے تھے۔ غالب نے پرخوباں سے ملاقات کے لیے مصوری سیکھی تھی۔ لیکن ہم نے "فری" میں پکچر دیکھنے کے لیے پاشا بھائی سے دوستی کی تھی۔ وہ ہماری قلاشی کا دور تھا۔ پکچر دیکھتے تو کیسے؟ ویسے شوق کی راہ میں بے سر و سامانی ہی "زادِ راہ" ہوا کرتی ہے۔ شوق کے حاملِ انسان کے جوہر تو بے سر و سامانی ہی میں کھلتے ہیں۔ خدا ہمارے استاد مرحوم کو کروٹ کروٹ

www.taemeernews.com

جنّت نصیب کرے، فرمایا کرتے تھے کہ خریدے ہوئے آم اور امرود کھانے میں وہ لُطف نہیں آتا جو لُطف کسی باغ سے چُرائے ہوئے آم یا امرود کھاتے میں آتا ہے"۔ استاد مرحوم تو یہ جملہ ازراہِ تفنن فرمایا کرتے تھے۔ لیکن پتہ نہیں یہ فقرہ ہمارے ذہن پر کیوں نقش کر گیا تھا۔ ویسے، انھوں نے اور بھی بہت سی عمدہ عمدہ باتیں اور زرین اقوال بھی بتائے تھے لیکن وہ یاد نہیں رہے تھے۔ سچ ہے اچھی باتیں ایک کان سے داخل ہو کر دوسرے کان سے نکل جاتی ہیں جب کہ بے ہودہ فقرے اور چیر کنیات وہزلیات وغیرہ جوں کا توں الور شیڈ کا ماز ین ذہن میں محفوظ رہ جاتی ہیں۔ اچھی باتوں کے علاوہ استاد مرحوم نے اقبال کے حوالے سے یہ نصیحت بھی کی تھی:

> خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

لیکن ہم نے اِسے یوں کر لیا تھا:

> خودی کو بیچ فقیری میں نام پیدا کر

چنانچہ جب شوق نے سر ابھارا تو ہم نے پاشا بھائی سے درخواست کی کہ "اے پاشا بھائی! جہاں آپ نے میرے دِل میں فلم بینی کا بیج بویا ہے، لگے ہاتھ اس کا ثمرہ بھی کھلائیے اور ثوابِ دارین پائیے"!

شانِ استغناء سے فرمایا "کوئی بات نہیں! کل شام نور یا ٹاکیز کی کینٹین میں آجانا۔ میں وہاں تمہارا انتظار کرتا رہوں گا"۔

وہ لوگ جو انتظار کی گھڑیوں سے گزرے ہوں، ہمارے کرب کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ رات کس قیامت سے گزری ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ رات گزری نہیں تھی بلکہ رات سے ہم گزرے تھے۔ خیر، خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ ہم صبح کی اذان سا تھ ہی پکچر کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ کپڑے دھوئے۔ خوب نہایا۔ کپڑے بدلا

www.taemeernews.com

کو استری کروانے کا جو ارادہ کیا تو پیسے نہیں تھے۔ اور گھر والوں سے مانگنے پر پیسوں کی بجائے پھٹکار ملنے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ پتلون اور شرٹ کو سلیقہ سے تہہ کرکے سرہانے رکھا اور پھر اس پر تکیہ جماکر سہ پہر تک خوب لوٹتے رہے۔ اس کے بعد جب کپڑوں کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ترکیب نہایت کارگر ثابت ہوئی تھی۔ پتلون پر تو غضب کی کریز کھیل رہی تھی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہر نئے نفر کو بھیک کی جلدی ہوتی ہے۔ ہمارا بھی کچھ ایسا ہی حال ہو گیا تھا۔ چنانچہ سرِشام کپڑے بدل کر تیار ہو گئے۔ حالانکہ وقت جو دیا گیا تھا، وہ سکنڈ شو کا تھا۔ گھر والوں نے ٹوکا بھی کہ بھری شام کہاں جاتے ہو؟ لیکن ہم سنی ان سُنی کر گئے۔ اور سیدھے 'لوریا ٹاکیز' کی راہ لی۔ گھومتے گھامتے جب ہم 'لوریا ٹاکیز' کی کینٹین میں پہنچے تو پاشا بھائی کو ایک ٹیبل پر منتظر پایا۔ ہمارے سراپا پہ نظریں گاڑتے ہوئے پہلے تو وہ مسکرائے اور پھر بولے "تم یہاں پکچر دیکھنے آئے ہو یا بر دکھاوے کیلئے؟" ہم جواباً کچھ عرض کرنا چاہتے ہی تھے کہ اتنے میں کینٹین کا بیرا وہاں آگیا۔ بیرے سے ہمارا تعارف کرواتے ہوئے پاشا بھائی نے فرمایا کہ "یہی ہے وہ رنگروٹ جسے آج پکچر دکھانا ہے!"

بیرے نے ہمیں سر سے پیر تک گھورتے ہوئے کہا "نہیں، یہ نہیں چلے گا۔ ان تو ایک دم جنٹلمین کے مافق (موافق) ہے۔ اس کا یونیفارم بدل کر لین والا چھوکرا بنانا پڑے گا۔ ورنہ بہار اکباڑا ہو جائے گا۔"

اس کے بعد وہ ہمیں کینٹین کے ایک گوشے میں لے گیا۔ وہاں اس نے اپنی ایک بوسیدہ نیکر اور بنیان ہمارے حوالے کرتے ہوئے ہدایت کی کہ ہم اپنا لباسِ فاخرہ اتار دیں اور یونیفارم پہن لیں۔ ہم پس و پیش کرتے رہے۔ تب اس بیرے نے

www.taemeernews.com

یہ نیک کام بھی اپنے ہی مُبارک ہاتھوں سے انجام دیا۔ ہم عرقِ انفعال میں غرق ہو چکے تھے۔ اُس روز یہ بات ہماری سمجھ میں آگئی کہ ڈرامہ والے کردار اور حقیقی کردار میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ اوّل الذکر میں داد و تحسین ملتی ہے تو موخرالذکر میں خجالت اور شرمندگی ہاتھ آتی ہے۔ ہم اسکول کے ڈراموں میں ایک سے ایک گھٹیا کردار کا رول ادا کر کے اساتذہ اور طلباء سے داد و تحسین حاصل کیا کرتے تھے لیکن آج ایک حقیقی بیرے کے رول میں کسی کو منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ جب ہم بیرے کا یونیفارم پہن چکے تو پاشا بھائی سے شکایت کی کہ اس یونیفارم میں سے تو پسینہ کی بو آرہی ہے! تو ہمارے دوست نے فرمایا کہ "یہ کوئی تمہاری محبوبہ کا لباس تو نہیں ہے جس سے سینٹ کی لو آئے۔ یار، یہ تو بیرے کا یونیفارم ہے۔ تھیٹر کے اندر داخل ہونے کا "پاس"۔ ورنہ "سُرمہ کا گڈا" پکڑ لے گا۔ اور بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا"۔ ——— (روا روی میں ہم یہ بتانا بھول گئے کہ "بوریا ٹاکیز" کے تھرڈ کلاس کا جو گیٹ کیپر ہوا کرتا تھا اسے لوگ "سُرمہ کا گڈا" کے لقب سے ہی یاد کیا کرتے تھے۔ اور یہ پھبتی اس پر پوری طرح چسپاں بھی ہوتی تھی۔ وہ اپنے لباس اور وضع قطع سے "گڈا" تو معلوم ہوتا ہی تھا۔ لیکن وہ اپنی آنکھوں میں سُرمہ کچھ اس طرح لگاتا، لگاتا نہیں، بھرتا تھا کہ یہ پتہ لگانا مشکل ہوتا کہ آنکھیں کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہیں اور سُرمہ کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتا ہے؟) ہاں تو ہم اپنے دوست پاشا بھائی کے اس مبارک یہ "نائٹل پچس" کے لئے اپنے آپ کو بیرے کے حوالے کیا۔ بیرے نے ہمارے چہرے پر اِدھر اُدھر دو چار کالک کے نشان لگا کر رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ اور پھر ہمارا لہجہ اور زبان دانی کو جانچنے کے لیے پوچھا "وَیل! ممبیٹر میں

www.taemeernews.com

جانے کے بعد تم کیا بولے گا؟"

ہم نے معصومیت سے جواب دیا "بولے گا کچھ نہیں، صرف پکچر دیکھے گا!"
ہنس کر بولا "پکچر دیکھے گا تو پھر یہ "سوڈا لیمن" کی آواز کیا میرا باپ لگائے گا؟"
وہ تو اچھا ہوا کہ بیرے نے اپنے جملے کی روانی کو صرف اپنے باپ تک ہی محدود رکھا۔ اس کے بعد اس نے چلنے کا انداز، سوڈا لیمن والی بوتلوں کے چھینکے کو پکڑنے کا اسٹائل، "سوڈا لیمن" کی آواز لگانے کا طریقہ، اور آواز لگاتے وقت منہ ٹیڑھا کرنے کا انداز جیسے منہ کو لقوہ مارا ہو — غرض سارے رموز سمجھائے اور خاصی ٹریننگ بھی دی۔ جب یہ سارے مراحل طے ہو چکے تو اس نے ریہرسل کے طور پر "سوڈا لیمن" کی آواز بلند کرنے کی خواہش کی۔ ہم نے اس کی خواہش کے احترام میں شرماتے، جھجکتے، دھیمے لہجے اور صحیح مخرج میں آواز لگائی:

"سوڈا لیمن! ٹھنڈا میٹھا! مزے دار!"

اس نے سر پیٹ کر (ہمارا نہیں، اپنا) کہا "ارے مزے دار نہیں! مجے دار، مجے دار! اور ذرا منہ ٹیڑھا کر کے بول!"

چنانچہ وہ کوئی آدھے گھنٹے تک ہم سے "مجے دار، مجے دار" کا ورد کرواتا رہا۔ جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ ہم اس کے رنگ میں رنگے جا چکے ہیں تو تب اس نے سوڈے والی بوتلوں کا چھینکا ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس طرح اس بیرے نے ہمارے شین قاف کو جو ہمارے اساتذہ کی کوششوں اور ہماری ریاضت کا ثمرہ تھا، صرف آدھے گھنٹے کی صحبت میں بگاڑ کر رکھ دیا۔ (ایسے ہی اختلاط سے لہجہ اور شناخت مسخ ہو جایا کرتے ہیں)۔

اس وقت تک سکنڈ شو کی تیسری گھنٹی بج چکی تھی۔ ہال میں اندھیرا

www.taemeernews.com

چھا گیا تھا اور فلم بھی شروع ہو گئی تھی۔ اب ہمارا چھوٹا سا قافلہ جو تین نفوس پر مشتمل تھا، کینٹین سے بوریا ٹاکیز کے تھرڈ کلاس کی جانب روانہ ہوا۔ آگے آگے کینٹین کا اصلی بیرا۔ اس کے پیچھے ایک ڈبلی کیٹ (یعنی پاشا بھائی)۔ اور پھر ان کے پیچھے ایک اور ڈپلی کیٹ (یعنی ہم)۔ اب یہ مت پوچھئے کہ ہال میں داخل ہونے کے بعد ہم نے کچھ سوڈا لیمن بیچا بھی تھا یا نہیں۔ یا صرف پکچر ہی دیکھتے رہے تھے۔ بہرحال کچھ ہو، وقفے وقفے سے ہماری یہ آواز ہال میں ضرور گونج رہی تھی:

"اے، سوڈا لیمن! ٹھنڈا، میٹھا... مجے دار والا!"

www.taemeernews.com

مرض بڑھتا گیا....!

ہماری زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا برس گزرا ہوگا جب کہ ہم بیمار نہ پڑے ہوں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بیماری ہمارے تعاقب میں لگی رہتی ہے۔ خُدا نے ہمارا دفاعی نظام ہی کچھ ایسا پیچیدہ اور کمزور بنایا ہے کہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بیماری کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ ہمارے جسم میں پائے جانے والے سفید جسیمے جنھیں جراثیم کے حملوں کو پسپا کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، انتہائی کاہل اور کام چور واقع ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں وہ اپنے فرائضِ منصبی کو بھول کر کہاں پڑے سو رہتے ہیں۔ اُن کے فرائضِ منصبی اور ہمارے محکمۂ پولیس کی کارکردگی میں بڑی حد تک مماثلات پائی جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی موسم کے تیور ذرا بدل جاتے ہیں تو مختلف قسم کے جراثیم ویزٹنگ ویزا کے بغیر ہی ہمارے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں اور اپنا پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔ اب تو ہمارے گھر والوں نے ہمارے مزاج اور موسم میں اس حد تک مطابقت پیدا کرلی ہے کہ اگر ہم چھینک دیں تو یہ اعلان کردیں گے کہ مطلع ابر آلود ہونے والا ہے۔ اگر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں تو یہ مُنادی کردی جائے گی کہ جاڑے کی آمد آمد ہے۔ اگر ہماری جلد پر پھنسیاں نمودار ہوں تو اڑوس پڑوس کو آگاہ کردیا جائے گا کہ وہ نئی اور کوری صراحیوں کا انتظام کرلیں، اس طرح ہمارے گھر کے سارے افراد ہمیں موسموں کی پیش قیاسی کا آلہ سمجھنے لگتے ہیں ـــــ

www.taemeernews.com

جب صورتحال اتنی عجیب و غریب ہو تو غور فرمائیے کہ پیدائش سے لے کر آج تک ہم نے کتنی بیماریوں کا مزا نہ چکھا ہوگا اور کتنے ہی ڈاکٹروں سے سابقہ نہ پڑا ہوگا ؟!

پچھلے برس کی بات ہے کہ ہماری ٹانگوں میں کچھ درد سا ہونے لگا تھا۔ اور اُٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے وقت جوڑوں سے کچھ عجیب قسم کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ اِن آوازوں کو الفاظ کا جامہ پہنانا نہایت مشکل ہے! ایسی آوازیں عموماً ان سیکلوں سے آتی ہیں جن کے بولٹ اور نٹ ڈھیلے پڑ گئے ہوں اور جھٹکے مار کھا گئے ہوں۔ گمان ہوا کہ اعصابی نظام میں کہیں خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ معائنہ کروانے کے لیے ایک لندن رٹرنڈ ڈاکٹر کے کلینک کو پہنچے جو اعصابی نظام اور جوڑوں کے علاج کے اسپیشلسٹ (SPECIALIST) سمجھے جاتے تھے (اِن کے کلینک کے بورڈ پر تو یہی لکھا ہوا تھا) اسپیشلسٹ کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے! ـــ اسپیشلسٹ اس کو کہتے ہیں جو کم سے کم مرض کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا ہو۔ ہاں تو بات اعصابی علاج کے اسپیشلسٹ کی ہو رہی تھی۔ ان کا طریقِ علاج یہ تھا کہ مریض سے فیس مشورہ وصول کرنے کے بعد اس کو مختلف معائنوں اور امتحانوں سے گزارتے تھے۔ جب تک معائنوں کی رپورٹیں وصول نہ ہوتیں مریض کو ہاتھ نہ لگاتے تھے البتہ وٹامن کی گولیوں سے مرض کے جراثیم کو بہلا اور پھسلاتے تھے۔ جب معائنوں کی رپورٹیں وصول ہو جاتیں اور ان کے مطالعے کے بعد کوئی مرض ان کے ہاتھ لگ جاتا تو باضابطہ علاج شروع کر دیتے تھے۔ جب اتنے سارے ڈاکٹروں کے تعاون کے باوجود بھی مریض بچ جاتا تو اس کا سارا کریڈیٹ اپنے سر لیتے تھے اور اگر دورانِ علاج، مریض مر جاتا تو معائنہ کنندگان کو قصوروار ٹھہرا کر

www.taemeernews.com

خود بری الذمہ ہو جاتے تھے۔ ہاں تو ہم، جیسے ہی ان کے کلینک کو پہنچے، اپنے آپ کو ان کے حوالے کیا۔ عرضِ حال سن کر ایک خاص قسم کی ہتھوڑی سے ہمارے گھٹنوں ٹخنوں اور کہنیوں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ اِن ماردن اور ٹھونکوں سے ان کی تشفی نہ ہوئی تو مزید اطمینان کے لیے آٹھ، دس اُٹھک بیٹھک کروائے۔ جب ہماری کرنے جواب دے دیا تو فرمایا "ایکسرے کرواؤ!" ایکسرے رپورٹ پیش کی تو حکم دیا "خون کا معائنہ کرواؤ!" اس سے بھی تشفی نہ ہوئی تو "بلڈ کلچر" کروانے کا حکم دیا۔ غرض اتنے سارے معائنے کروائے کہ ایلوپیتھی طریقِ علاج پر سے ہمارا اعتقاد اُٹھ گیا۔ یوں بھی اتنے سارے معائنوں کے بعد ہم بالکل قلاش ہو گئے تھے۔

اِس ڈاکٹر سے مایوس ہونے کے بعد ہم نے ایک ایسے ڈاکٹر کی ڈسپنسری کا رُخ کیا جو مرض کے بارے میں مریض سے کچھ بھی نہیں چھپاتے تھے بلکہ صاف صاف بتا دیتے تھے۔ مثلاً مریض کو کون سا مہلک مرض لاحق ہے۔ مریض کا اس دنیا میں کتنے دن کا دانہ پانی باقی ہے۔ کتنے فی صد مریض اس مہلک مرض سے مر جاتے ہیں اور بھارت میں مرنے والوں کا PERCENTAGE کتنا زیادہ ہے۔ مریض کے لیے کون سا دن یا کون سی رات بھاری ہو سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایسے انکشافات سے مریض کی حالت کتنی اَبتر ہو سکتی ہے۔ قوت ارادی کی کمی اور کم حوصلہ رکھنے والا مریض تو وہیں پھڑ پھڑا کر ڈاکٹر کے قدموں میں دَم توڑ دے گا۔ چونکہ ہم کو اس قسم کے ڈاکٹر سے سابقہ نہیں پڑا تھا اس لیے جان ہتھیلی پہ لیے ان کی ڈسپنسری کو پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے چہرے پر ہوائیاں اُڑتیں دیکھ کر بلڈ پریشر چیک کیا اور پھر اپنے آلہ کو بڑی احتیاط سے بند کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا "کیا آپ چل کر آئے ہیں؟"

www.taemeernews.com

ہم نے عرض کیا "جی نہیں ڈاکٹر صاحب! سائیکل پر آیا ہوں!"
فرمایا "حیرت ہے آپ کے سائیکل پہ آنے پر۔ آپ کو تو راستہ ہی میں کہیں گر کر مر جانا چاہیئے تھا۔ آپ کا بلڈ پریشر انتہائی LOW ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ کا ہارٹ فیل کیوں نہیں ہوا؟ اِس قسم کے مریض کو تو اسٹریچر پر لایا جاتا ہے!"

اب آپ ہی غور فرمایئے کہ مریض کے منہ پر اِس طرح بے ساختہ گھناؤنی تعریف میں آتا ہے یا بیزاری! وہ تو ہم ہی تھے جو قوتِ ارادی کے بل بوتے پر موت کے منہ سے نکل آئے۔ اگر کوئی کمزور دل کا مریض ہوتا تو وہیں غش کھا کے گر جاتا اور آن واحد میں اس کی روح وہیں پرواز کر جاتی۔ ہم آج تک کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے منہ پر فی الفور اور فی البدیہہ قسم کے جو کلمات کہے تھے ان سے ہماری حوصلہ افزائی مقصود تھی یا ہوٹنگ۔

ایلوپیتھی طریقِ علاج سے فرار حاصل کر کے ہم نے ایک حکیم یونانی کے مَطب کا رُخ کیا کہ دیکھیں وہاں ہمارے علاج کے لیے کیا اہتمام ہے۔ ہمارے مرض کے بارے میں سُننے سے پہلے ذرا حکیم صاحب کے بارے میں سن لیجئے۔ ساٹھ کے پیٹے میں تھے اور ذرا اُونچا بھی سُنتے تھے (بھلا ان کے اُونچا سننے پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے) نام اُن کا بُرہان الدین تھا۔ ڈاکٹروں کے علاج اور انگریزی دواؤں کو سِرے سے مانتے ہی نہیں تھے۔ اور اپنے سوا دیگر یونانی اطباء کے نسخوں کو رَد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ہمیشہ "قاطع برہان" بنے بیٹھے رہتے تھے۔ چونکہ ذرا اُونچا سُنتے تھے، اس لیے مریض کو حاضرینِ محفل کے روبرو ببانگِ دہل یہ اعلان کرنا پڑتا تھا کہ وہ کس پیچیدہ مرض میں مبتلا ہے چاہے وہ مرض "امراضِ پوشیدہ" کی فہرست ہی میں کیوں نہ آتا ہو؟ شرمیلے اور پڑھے لکھے مریض اپنے مرض کی تفصیلات کا غذ پر بتانے میں ہی اپنی عافیت

www.taemeernews.com

سمجھتے تھے۔ تفصیلات لکھتے وقت املا اور انشاء کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اگر مریض اَن پڑھ ہو تو اُس کے لیے یہ ضروری ہو جاتا تھا کہ وہ ایک عدد منشی کو بھی اپنے ساتھ رکھے۔ جس دن ہم حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے وہاں ایک ایسا نیا مریض بھی آیا ہوا تھا جو گنوار اور اَن پڑھ تھا۔ چونکہ وہ حکیم صاحب کی صفتِ ثقلِ سماعت سے ناواقف تھا اس لیے اپنے ساتھ ایک عدد منشی کو نہیں لایا تھا۔ اپنی باری آنے پر اُس نے اپنا مرض بتایا

"مجھے اجابت ہے"!

حکیم صاحب نے جھٹ فرمایا "اچھا تو اجازت ہے"!

یہ سُنتے ہی وہ مریض اُلٹے پاؤں لَوٹ گیا۔

اس کے بعد ہماری باری آئی۔

ہم نے کاغذ پر لکھ دیا "گیس ستاتی ہیں!"

حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا "گیس، پریسیڈنٹ ریگن کو بھی ستایا کرتی ہیں آپ کِس شمار میں ہیں؟"

پھر اس کے بعد حکیم صاحب نے ہماری نبض پر اپنا ہاتھ رکھا۔ آنکھوں کے پپوٹے چیر چیر کر اس حد تک آنکھوں کا معائنہ کیا کہ آنسو نکل پڑے۔ زبان کو اس حد تک بکالنے کو کہا کہ رال ٹپک پڑی۔ پھر اس کے بعد ہماری ذات میں اتنے سارے امراض تشخیص کیے کہ اپنے آپ پر "مجموعۂ امراض" کا گمان ہونے لگا۔ یہ سچ ہے کہ عمارت جب ذرا پُرانی ہو جاتی ہے تو MINOR REPAIRS کی مرمت کے وقت اچانک MAJOR REPAIRS بھی منظرِ عام پر آ جاتے ہیں۔ ویسے ہم اتنی پرانی اور مخدوش عمارت تو نہیں تھے کہ حکیم صاحب ہماری ایک ذات میں اتنی ساری بیماریاں تلاش

www.taemeernews.com

کرتے۔ وہ تو ہمارا ہی ظرف تھا کہ اتنے سارے امراض کی تفصیل خندہ پیشانی سے سماعت کی۔ اگر کوئی دوسرا مریض ہوتا تو اس کی آنکھوں میں خون اُتر آتا اور وہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتا جو قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہوتی تاہم ہم نے حکیم صاحب سے علاج کروانے کی ٹھان لی۔

حکیم صاحب ہمیں روزانہ میٹھے میٹھے معجون دیتے جو ہم "قلاقند" سمجھ کر کھا لیا کرتے تھے۔ اُن کی دی ہوئی جوارشیں اور معجون کھا کر جی ہی چاہتا تھا کہ ہم شفایاب نہ ہوں۔ غرض علاج کا جو سلسلہ شروع ہوا تو بس چلتا ہی رہا اور ہم حکیم صاحب کے مطب کے چکر کاٹتے ہی رہے۔ ہمارے ان چکروں کو دیکھ کر دوسرے مریض یہ سمجھ بیٹھے کہ حکیم صاحب کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ مریضوں کا رجوعہ کم ہوتا گیا۔ بالآخر حکیم صاحب سے رہا نہ گیا۔ ایک دن ہاتھ جوڑ کر فرمایا۔ "میں باز آیا آپ کے علاج سے۔ آج سے آپ نہ میرے مریض اور نہ میں آپ کا طبیب۔ پھر کبھی اِدھر کا رُخ کیا تو دواؤں کے ٹب میں غوطے دوں گا۔"

حکیم صاحب کے پاس سے نکالے ہوئے دو دن ہی گزرے تھے کہ اچانک ہماری شہادت کی انگلی میں کچھ ٹیس سی شروع ہو گئی۔ جب درد نے شدت اختیار کی تو ہم صاحبِ فراش ہو گئے۔ ہمارے دشمن خوش ہو گئے کہ دوسروں پر انگلی اٹھانے اور غلطیوں کی نشان دہی کرنے کی سزا ہمیں مل گئی ہے۔ پھر تو عیادت کرنے والوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہم بیماری سے اتنا نہیں گھبراتے جتنا کہ عیادت کو آنے والوں سے گھبراتے ہیں۔ کیونکہ دوست احباب مریض کی عیادت کم کرتے ہیں اور پھل اور بسکٹ زیادہ کھا جاتے ہیں بلکہ بعض تو صرف پھل اور بسکٹ ہی کھانے کے لیے آتے ہیں۔ چنانچہ اسی اندیشے کے پیشِ نظر

www.taemeernews.com

ہم اپنی علالت کی نیوز اخبار میں نہیں چھپواتے۔ نہیں اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ہماری علالت کی نیوز ہمارے دوستوں کے حق میں INVITATION CARD ثابت ہوگی اور ہمارا دیوالیہ نکل جائے گا۔!

---

www.taemeernews.com

داڑھی سے پہلے، داڑھی کے بعد

جب کبھی داڑھی کا ذکر چھڑتا ہے تو مجھے اپنا گاؤں یاد آتا ہے۔ اور جب گاؤں یاد آتا ہے تو مجھے اپنی داڑھی کا قصہ یاد آتا ہے۔ اور جب داڑھی کا قصہ یاد آتا ہے تو مجھے بےساختہ ایک داڑھی والا لطیفہ یاد آتا ہے۔ دراصل یہ ایک نفسیاتی معاملہ ہے۔ فی الحال نفسیات کو رہنے دیجئے۔ اور وہ لطیفہ سن لیجئے۔

ایک جلسے میں ایک مولانا "داڑھی اور اخلاقیات" کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کیا کر رہے تھے گویا واعظ فرما رہے تھے۔ اتفاق سے ان کی داڑھی سائز کے عین مطابق، ایک مشت نہیں تھی۔ سامعین میں ایک صاحب سے رہا نہ گیا۔ بلند آواز میں کہا:

"مولانا کو دیکھئے! داڑھی اور اخلاق پر تقریر تو کر رہے ہیں۔ لیکن ان کو اپنی داڑھی کے سائز کی خبر نہیں!"

معترض کے بازو ہی ایک ایسے صاحب بیٹھے ہوئے تھے جن کی داڑھی کافی بڑی تھی۔ انہوں نے معترض کو سمجھایا:

"قبلہ! آپ ذرا خاموش بیٹھئے۔ اور دوسروں کو واعظ سننے دیجئے۔ اگر آپ واعظ نہ سننا چاہتے ہوں، اور صرف داڑھی دیکھنا پسند کرتے ہوں تو پھر میری داڑھی دیکھئے جو بفضل تعالیٰ سائز میں کافی بڑی ہے۔"

www.taemeernews.com

اس لطیفہ کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارا شمار بھی داڑھی رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری داڑھی سائز کے عین مطابق نہیں ہے۔ لیکن یہ اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے کہ "خشخشی داڑھی" کی تعریف میں آئے، اور جسے دیکھنے کے بعد کوئی شاعر محترم اس کی صفائی کا منظوم مشورہ دیں، جس طرح اگلے وقتوں میں ایک تنگ بند شاعر نے نواب شہاب جنگ کی نوکری کو چھوڑنے اور خشخشی داڑھی رکھنے والوں کو مونڈنے کا بذریعہ شعر مشورہ دیا تھا: ؎

"خشخشی داڑھی" سے صفائی بہتر
شہاب جنگ کی نوکری سے گدائی بہتر

_____ خواہ داڑھی چھوٹی ہو یا بڑی، باوجود بے جان ہونے کے، اپنے اندر اظہار کی ایک بے پناہ طاقت بھی رکھتی ہے۔ اور داڑھی رکھنے والے کی شخصیت عیاں ہو جاتی ہے۔

ہماری داڑھی کی کہانی بھی بڑی عجیب و غریب ہے۔ 'عجیب' اس لیے کہ اس نے نمودار ہونے میں کافی دیر لگا دی تھی۔ اور 'غریب' اس لیے کہ مجھ غریب کو بڑے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ یوں تو ہمارے جوان ہونے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن داڑھی کو شاید ہمارے بالغ ہونے کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی جب کہ ہمارے ہم عمر ساتھیوں نے اپنی داڑھیوں کی کئی فصلیں کاٹ ڈالی تھیں۔ یہی نہیں، ہم سے جونیروں تک نے اپنے چہروں کو بلیڈوں سے چھیل چھیل کر "ریگمال" میں تبدیل کر لیا تھا۔ پتہ نہیں، ہماری داڑھی کو کیا ہو گیا تھا جو برآمد ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

ہماری داڑھی کی فکر ہم سے زیادہ، ہمارے دوستوں کو تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ

www.taemeernews.com

ایک بہترین موضوع ان کے ہاتھ لگا تھا۔ جب کبھی موقع ملتا وہ ہم پر فقرے کستے:
"میاں! تم ہمارے ساتھ کیوں رہتے ہو؟ بالغوں کے ساتھ نابالغ کا رہنا کچھ مناسب نہیں۔ یا تو دوستی چھوڑ دو۔ یا کسی نائی سے رجوع کرکے داڑھی اگانے کا نسخہ حاصل کرلو۔"

بالغوں کی فلم دیکھنے کے لیے نکلتے تو طعنے دیتے۔
"برخوردار! تم کو ساتھ رکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ جاؤ مصنوعی داڑھی لگالو! اگر یہ مناسب نہ سمجھتے ہو تو کم از کم نوجوان کا سا میک اپ کرلو۔ اگر یہ بھی ناممکن ہو تو تم اپنے ساتھ میٹرک کی سند کی "ٹردکاپی" رکھا کرو تاکہ کیو سے نکالے جانے کی نوبت آجائے تو عمر کی تصدیق ہو سکے!"

ہم دوستوں کے طعنوں کو خوشگوار موڈ سے کر برداشت کرلیا کرتے کیوں کہ مجبور جو تھے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ شادی کے فوری ایک سال بعد دلہن کی گود ہری بھری نہ ہوجائے تو سسرال میں بڑی بھیانک قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں اور مختلف قسم کی افواہیں گشت کرنے لگ جاتی ہیں۔ ایسی ہی کچھ افواہیں ہمارے دوست نما دشمنوں نے پھیلادی تھیں جن کا تدارک داڑھی برآمد کئے بغیر ناممکن تھا۔ یہ کوئی اولاد کا مسئلہ تو نہیں تھا جو کسی کا بچہ گود لے کر حل کرلیا جاتا۔ یہ تو صاحب ریش کہلانے کا مسئلہ تھا جو کسی کی داڑھی مستعار لے کر حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جب دوستوں کے شرارت آمیز تبصرے حد سے تجاوز کر گئے تو ہم نے یہ سوچ کر کہ ہر شر میں خیر کا کوئی نہ کوئی پہلو پوشیدہ رہتا ہے، داڑھی نہ ہونے کی کوتاہی کا بڑی سنجیدگی سے جائزہ لیا تو ہمیں بعض خاص قسم کی سہولتیں اور رعایتیں حاصل ہوتی نظر آئیں جو ہمارے دوستوں کو کسی قیمت حاصل نہ ہو سکتی

www.taemeernews.com

جبیں: ہمیں ایک خاص قسم کی سہولت "ہاف ٹکٹ" کی حاصل تھی جسے ہم محض بے خبری میں فراموش کر بیٹھے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس سہولت سے استفادہ کرنا شروع کر دیا ـــــ بس کے سفر میں جہاں کنڈکٹر ہمارے دوستوں کو فل ٹکٹ جاری کرتا، ہم تھوڑی سی رد و قدح کے بعد "ہاف ٹکٹ" حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے، اور ہمارے دوست منہ دیکھتے رہ جاتے۔ یہ بچت ہمارے جیب خرچ کے کام آتی۔ ہمیں ایک اور خاص قسم کی سہولت اور رعایت حاصل تھی جس کا تعلق جمالیاتی ذوق کی تسکین سے ہے ـــــ جب کہیں کوئی حسن کا دربار سجتا تو ہم وہاں بے دھڑک گھس جاتے جب کہ ہمارے دوست محض اپنے ریگمالی چہروں کی وجہ سے گیٹ پر ہی دھر لئے جاتے اور خوب رُسوا ہوتے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں سے ہمارے دوستوں کی پرواز ختم ہو جاتی وہاں سے ہماری پرواز کا آغاز ہوتا۔ شادی بیاہ کے موقع پر جب خواتین سے ہمارا آمنا سامنا ہوتا تو وہ کوئی نوٹس نہ لیتیں اور بچہ سمجھ کر درگزر کر جاتیں۔ اس کے برعکس ہمارے دوست بڑے بے آبرو ہو کر نکلتے۔ ہماری ان فتوحات کو دیکھ کر ہمارے دوست جل کر کہتے کہ "یہ بدمعاش عیب کو ہنر بنا کر استفادہ حاصل کرتا جا رہا ہے!"

بڑی منتوں اور مُرادوں کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہماری ٹھوڑی پر دو چار بال نکل آئے۔ ہم مارے خوشی کے دوڑے دوڑے دوستوں کی محفل میں جا پہنچے اور اپنی دو چار بال والی جمالی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر نعرہ لگایا کہ "لو آج ہم بھی صاحبِ ریش ہو گئے!"

اس نعرے پر ایک دوست نے ہمارے چہرے کی طرف غور سے

www.taemeernews.com

دیکھتے ہوئے یہ فقرہ کسا:

"یہ دو چار تنکے بھی کوئی داڑھی ہے؟ اور تم ہو کہ اس پر ہاتھ بھی پھیر رہے ہو! اس پر ہاتھ نہیں صرف اُنگلی پھیری جا سکتی ہے۔ اس سے اچھی داڑھی تو بعض عورتیں پیدا کر لیتی ہیں۔ جاؤ فوراً بلیڈ سے صاف کراؤ۔ ورنہ چین کی راہ لو۔ وہاں اس قسم کی داڑھیاں بڑی پاپولر ہیں۔ کیا عجب کہ چین پہنچنے کے بعد اخباروں میں یہ سرخی لگے ___ "ہیون سانگ کی واپسی!""

ہم نے اس تلمیح طلب فقرے کا یہ مطلب نکالا کہ ہندوستان کی تاریخ میں جس چینی سیاح کا ذکر ملتا ہے اُس کی داڑھی ہماری داڑھی سے ملتی جلتی تھی۔ لیکن ہم نے چین جانے کے مشورے کو اس لئے قبول نہیں کیا کہ وہاں پہلے ہی سے آبادی کی کثرت ہے۔ اور ہم اس کثرت میں اضافہ کا سبب بن کر غلے کی قلت کا باعث بننا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ دوسرے ہی روز ہم نے اپنی دو چار تنکوں والی داڑھی کو خیرباد کہہ کر اپنے چہرے کو غیر آباد کر لیا۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جب کوئی نوجوان دو تین روز شیو نہ کرے تو اس کے چہرے پر کالی چیونٹیاں سی نمودار ہو جاتی ہیں۔ ایک بار کچھ ایسا ہوا کہ کسی مجبوری کے تحت ہم تین روز تک شیو نہ کر سکے۔ چوتھے روز کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے چہرے پر دونوں گالوں کی حفاظت کے لیے کالے سپاہیوں کا ایک لشکر جرار کھڑا پہرہ دے رہا ہے۔ ہم نے اس پہرہ کو ہٹانے کے لیے جوں ہی چہرے پر برش سے صابن لگایا، دل کی گہرائیوں سے ایک آواز ابھری:

"اے نوجوان! تو یہ کیا ظلم کرتا ہے!؟ تو ہر روز ہم کو بلاتا ہے اور پھر ہمارا قتل عام کرتا ہے! کیا داعی کا یہی فریضہ ہے؟"

www.taemeernews.com

ہم یہ سوچ کر کہ یہ ایک نفسیاتی اُلجھن ہے، اُس طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور اپنا عمل جاری رکھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ آواز ایک خاموش چیخ میں تبدیل ہوگئی۔ پھر تو ہم نے دل کی آواز پر لبیک کہا اور پھر داڑھی چھوڑ دی۔

داڑھی چھوڑنا ہی تھا کہ گاؤں کے لوگ ہم کو مُلّا اور مولوی قسم کا آدمی سمجھنے لگے۔ گاؤں والوں سے مشکل یہی ہے کہ وہ داڑھی والے کو دیکھ کر مُلّا یا مولوی سمجھ لیتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اور بے کاری اور بے روزگاری میں ایک مصروفیت نکل آئی۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا جب کہ کوئی حاضری نہ دیتا! ہر روز کوئی نہ کوئی مصروفیت نکل آتی! کبھی کوئی لڑکا آکر درخواست کرتا کہ "ذرا گھر چل کر فاتحہ دیجئے۔ گھر میں کوئی بڑا آدمی نہیں ہے"! (ساتھ ہی تھوڑا سا تبرک بھی چکھ لیجئے!) کبھی کوئی بڑی بی آکر گوش گزار کرتیں کہ "داماد صاحب تشریف لائے ہیں۔ ان کے حلق سے روٹی اور دال اُترنے والی نہیں۔ ذرا گھر چل کر مرغی کی خبر لیجئے"۔ کبھی کوئی بڑی بوڑھی خاتون آکر پوپلے منہ سے یہ مژدہ سناتیں کہ "بہو کو بچہ ہوا ہے۔ ذرا چل کر نومولود کے کان میں خدا کی بڑائی بیان کیجئے"۔ مختصر یہ کہ جب تک ہم گاؤں میں رہے ہماری داڑھی نے ہمیں بےحد مصروف رکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم نے کسی پیشہ ور مولوی کی طرح اس کو اپنی آمدنی کا ذریعہ نہیں بنایا۔

داڑھی کے ذکر پر یاد آیا کہ داڑھی کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ جیسے خشخشی داڑھی، فرنچ کٹ داڑھی، بکرے کی داڑھی، جھالر نما داڑھی، باڑھ نما داڑھی، خدائی داڑھی، جمالی داڑھی، کمالی داڑھی، جلالی داڑھی، سوالی داڑھی وغیرہ۔ ہاں! ایک سیاسی داڑھی بھی ہوتی ہے کہ جب جی چاہا بڑھا لو اور جب جی چاہا مونڈ لو (یا مونڈ دو)۔

www.taemeernews.com

ان تمام داڑھیوں میں ہم کو سوائی داڑھی پسند نہیں۔ ہمیں وہ داڑھی پسند ہے جس میں کوئی تنکا نہ ہو ۔۔۔!

www.taemeernews.com

اِملی کی مدح میں!

قُدرت نے سرزمینِ دکن کو املی کے درختوں سے مالا مال کیا ہے۔ یہاں املی کے بن کے بن پائے جاتے ہیں۔ اُلّو جو راتوں میں جاگنے اور مصرعۂ طرح دینے کے عادی ہوتے ہیں، املی کے بنوں میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ دکن میں جاڑے کا موسم اور املی کا سیزن ساتھ ساتھ تشریف لاتے ہیں۔

املی پھل بھی ہے، ترکاری بھی اور میوہ بھی۔ بچے تو کچّی املیوں کو گاجروں کی طرح کھا جاتے ہیں۔ اور حسبِ استطاعت کھانسی میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔ کچّی املی کو کچا ہی کھا جانے کے لیے بلند حوصلے اور اعلیٰ ظرفی کی ضرورت ہوتی ہے۔ املی کے سیزن میں چھوٹے بچے املی کھا کھا کر بلند حوصلے اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہیں۔ عورتوں کی طبیعت اگر بے تحاشہ املی کی طرف مائل ہو تو یہ ایک قسم کا سِگنل ہے کہ عنقریب ان کے گھر ایک اور املی خور آنے والا ہے۔

املی مونث ہے۔ اس کا مذکر نہیں۔ یہی بات جب ہم نے ایک "ڈاکٹر مُجتبیٰ" قسم کے ریسرچ اسکالر سے کہی تو فرمایا "آپ قواعدِ اردو میں خاصے کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ تک نہیں معلوم کہ "املی" کا مذکر "املا" ہے اور یہ لفظ ارضِ دکن سے نکلا ہے"!

آج کل ایسی ہی چونکا دینے والی ریسرچ پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں ملنے لگی ہیں۔

www.taemeernews.com

اِملی کھانے کے بعد گلے میں ایک عجیب طرح کا لوچ پیدا ہوتا ہے جیسا کہ بادی خواتین کے ڈھولک کے گیت اِسی لیے مشہور ہیں کہ وہ اِملی استعمال کرتی ہیں۔

اِملی سے جو آسان ڈِش تیار کی جاتی ہے، اس کا نام ہے 'کھٹا'۔ کھٹا دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک کچا کھٹا۔ دوسرا بگھارا کھٹا۔ کچا کھٹا تیار کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جو سہولت انڈا ابالنے میں ہے، اس سے کہیں زیادہ سہولت کچے کھٹے کی تیاری میں ہے۔ بیچلرس بڑی آسانی سے یہ ڈِش تیار کر سکتے ہیں اور شادی کئے بغیر "بیچلرز کوارٹرس" میں برسوں زندگی گزار سکتے ہیں۔ کچا کھٹا تیار کرنے کا نہایت آسان طریقہ، بلکہ یہ ایک طریقہ ہے کہ پہلے آپ اِملی کو پانی میں ڈال دیجئے۔ اِملی اگر کچی ہو تو ابال لینا چاہیئے پھر سیدھے ہاتھ سے خوب متھیئے (دونوں ہاتھوں سے نہیں) متھنے کے بعد جو چیز حاصل ہوتی ہے اس کو سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کی دراڑوں میں سے گزار کر چھان لیجئے اس کے بعد "حاصل" میں نمک ملائیے۔ مرچ اس قدر ملائیے کہ اس کی تیزی سے منہ جلنے لگے۔ نمک اور مرچ ملانے کے عمل کے دوران چکھ کر دیکھ لینا کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ لیکن اس حد تک مت چکھیئے کہ کھٹا ہی ختم ہو جائے۔ پھر اس کے بعد پیاز کاٹ لیجئے۔ لیجئے کھٹا تیار ---!

کچے کھٹے کے ذریعہ ہوشیار بیویاں بھولے بھالے شوہروں کو کفایت شعاری کا سبق سکھاتی ہیں۔ اور پھر اس طرح بس انداز کئے ہوئے پیسوں سے وہ اپنے میک اَپ کا سامان خریدتی ہیں۔ مہمانوں کو بھگانے کے لیے کچے کھٹے سے زیادہ مجرب نسخہ ابھی دریافت نہیں ہوا۔ گاؤں کی ہوشیار ساس "دیر قیام" داماد کو کچے کھٹے کے ذریعہ ہی بھگاتی ہے۔ اب ہم آپ سے کیا

www.taemeernews.com

چھپائیں۔ ہم بھی "دیر قیام" مہمان کو بھگانے کے لیے یہی نسخہ آزمایا کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ نسخہ بھی بُری طرح ہاتھ دے جاتا ہے۔ گزشتہ مہینے ہی کی بات ہے کہ ہمارے گھر ایک ایسے مہمان آئے جو کسی طرح جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ہم تو مہمان نوازی کے فرائض انجام دیتے دیتے عاجز آ چکے تھے۔ چنانچہ جب پانی ہمارے سر سے اُونچا ہوگیا تو ہم نے آخری حربہ کے طور پر کھٹے کو آزمانا شروع کیا اور مُسلسل پانچ دن تک اپنے مہمان کی کچے کھٹے سے تواضع کرتے رہے۔ لیکن "اثر اس پر ذرا نہیں ہوتا" کے مصداق ان پر کھٹے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ جیسے جیسے ہم کھٹا کھلاتے رہے ویسے ویسے ان کا ہاضمہ دُرست ہوتا گیا اور اُلٹا ان کی بھوک کھلتی گئی۔ جب یہ نسخہ بھی آج کل کی پیٹنٹ دواؤں کی طرح ناکام ہوگیا تو ہم نے ان کی توجہ تاریخ قیام و طعام اور وزیٹنگ ویزا کی مُدت کے اختتام کی جانب مبذول کروائی:

"جناب! کیا آپ جانتے ہیں کہ آج مہینے کی کونسی تاریخ ہے؟"
معزز مہمان نے مُسکراتے ہوئے فرمایا "مہینے کی تاریخ تو یاد نہیں! البتہ کھٹے کی آج پانچ تاریخ ہے۔"!

ہاں تو ہم یہ بتانا ہی بھول گئے کہ کھٹے کی ایک اور قسم بھی ہے ـــــ اعجاز حسین کھٹا۔ جب بھی ہمارے دستر خوان پر کھچڑی اور کھٹا رکھ دیئے جاتے ہیں تو اعجاز حسین کھٹا بے ساختہ یاد آنے لگتے ہیں[1]۔

جہاں تک بگھارے کھٹے کی تیاری کا تعلق ہے یہ بھی کوئی مُشکل کام نہیں۔ بگھارا کھٹا تیار کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ شیخیاں بگھارنا۔ ویسے بگھارا کھٹا اس وقت

---

[1] دکن کے ممتاز شاعر اعجاز حسین کھٹا۔

www.taemeernews.com

نمک مزہ نہیں دیتا جب تک کہ اس میں چوڑیوں کی کھنک شامل نہ ہو۔

املی کے استعمال سے طبیعت تجارت کی طرف راغب ہوتی ہے۔ آندھرا کے جتنے بھی کامیاب تاجر ہیں وہ کسی نہ کسی عنوان سے املی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے "اِڈلی" کے ساتھ "سامبر"، "وَڈا" کے ساتھ سامبر، چاول کے ساتھ "سامبر" وغیرہ وغیرہ کے ساتھ "سامبر"۔ "سامبر" میں اِملی کچھ اس طرح ملائی جاتی ہے کہ اسے دیکھنے کے لیے دیدۂ بینا سے کہیں زیادہ "دیدۂ بینا" چاہیے۔

کچّی اِملی اوائل عمر کے ایام طے کر کے جوانی میں قدم رکھتی ہے تو وہ گدّر اِملی کہلاتی ہے۔ گدّر اِملی کا بدن بھی گدرایا ہوا ہوتا ہے۔ گدر املی کو دیکھتے ہی ہر ایک کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ حتیٰ کہ بڑے بوڑھے تک گدّر املیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن، چوں کہ ان کے منہ میں دانت نہیں ہوتے، اس لیے صرف گھورنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ مصنوعی بتیسی لگاکر گدّر اِملی کھانے سے دانت کھٹے نہیں ہوتے۔ گدّر اِملی کا استعارہ پندرہ سولہ سال کی مہ جبیں پر "جینس" کی طرح بالکل چُست بیٹھتا ہے۔

اِملی کا شباب نہایت ہی عارضی ہوتا ہے۔ وہ بہت جلد گدری اِملی سے پکّی اِملی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ اس کو گھر میں کہیں بھی رکھیں، پڑی رہے گی۔ پکّی اِملی کو محفوظ رکھنے کے لیے فریج کی قطعی ضرورت نہیں۔ ارضِ دکن کے باشندے جب بیرونِ ملک تشریف لے جاتے ہیں تو کھٹے کے لیے بڑے بے چین رہتے ہیں۔ حج کے لیے جانے والے بعض بزرگ تو احتیاط کے تقاضہ کے پیشِ نظر زادِ راہ کے طور پر اِملی کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

بیرونی ممالک میں کام کرنے والے حیدرآبادی جب اپنے وطن کو واپس

www.taemeernews.com

ناشتے میں قوام کا جی بُری طرح کھٹی دال کھانے کی طرف مائل رہتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ املی ہی انھیں حیدرآباد کھینچ لے آتی ہے۔ ایک حیدرآبادی کو ہفتے میں کم از کم ایک آدھ بار تو کھٹی ڈش ملنی چاہیئے۔ ورنہ وہ اندر سے بالکل بجھا بجھا سا رہے گا اور سارے کام چوپٹ کر دے گا۔ ہمارے دوست احباب جب کبھی قلیجی ریاستوں سے تشریف لاتے ہیں تو روزانہ ناشتہ میں کھچڑی کھٹا اور قیمہ کی فرمائش کرتے ہیں۔

ہم کوئی حکیم یا طبیب تو ہیں نہیں کہ املی کے فوائد اور نقصانات کے بارے میں بتا ئیں۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ املی میں کیلشیم ہوتا ہے یا پوٹاشیم۔ البتہ ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یونانی طب میں املی کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ یونانی اطبا املی سے اصلاحِ معدہ کا کام لیتے ہیں۔ اصلاحِ معدہ کے لیے جو یونانی دوا تیار کی جاتی ہے اسے "صفرہ شکن" کہتے ہیں۔ صفرہ شکن معدہ کی اصلاح کے لیے صفرہ شکن کا کام انجام دیتا ہے۔ اور پھر اس کی ایسی اصلاح کرتا ہے کہ ایک طویل عرصے تک صفرہ کو سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی۔ صفرہ شکن کھٹ مٹ قسم کا ہوتا ہے۔ لڑکوں کو اگر ایک بار اس کا مزہ لگ جائے تو وہ روزانہ صفرہ کا بہانہ کر کے سارا مرتبان صاف کر دیں۔ صفرہ شکن بھوک کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔ اور اشتہا کو بڑھاتا ہے اسی لیے اس کو گرانی اور کنٹرول کے زمانے میں استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔

صفرہ کو مارنے کے لیے املی کا استعمال مفید ہے۔ ظاہر ہے جب صفرہ مر گیا تو مزاج میں اعتدال پیدا ہوگا۔ اور اس اعتدال سے مزاح جنم لے گا۔ دکن میں مزاح نگاری کو محض اس لیے فروغ حاصل ہوا کہ یہاں املی کی بہتات ہے۔ باہر کے ادیب جب حیدرآباد میں بس جاتے ہیں تو پھر وہ بھی مزاح نگاری شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے شہر میں پنجاب کے دو ایسے آئی اے ایس عہدہ دار

www.taemeernews.com

بھی ہیں جو حیدرآباد آنے سے پہلے افسانہ نگار تھے۔ ہمارا اشارہ جناب بھارت چند کھنہ اور جناب نریندر لوتھر کی طرف ہے۔ جب ان دو حضرات کو املی راس آئی تو انھوں نے باضابطہ مزاح نگاری کا آغاز کیا۔ اور املی کی بدولت مزاح نگاری میں خوب نام کمایا۔ شاید اب آپ یہ پوچھیں کہ کیا آپ نے انھیں املی کھاتے یا کھٹا استعمال کرتے دیکھا ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ کھانے والے یہ تھوڑے ہی بتا کر کھاتے ہیں کہ دیکھو بھئی ہم املی کھا رہے ہیں اور کھٹے کی چسکیاں لے رہے ہیں؟!

تفنن برطرف! اس سے آپ ہرگز یہ مراد نہ لیں کہ کھٹے کے استعمال سے مزاح نگاری آجاتی ہے۔ چنانچہ ایسی ہی غلط فہمی میں پڑ کر ہمارے ایک ناعاقبت اندیش دوست نے مزاح نگاری سیکھنے کے لیے کھٹا پینا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے دن پیچش میں مبتلا ہو کر نڈھال ہو گئے۔ تب ہم نے انھیں سمجھایا کہ مزاح نگاری کے لیے کھٹے سے کہیں زیادہ عقل سلیم کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ چوں کہ ان کے پاس عقل سلیم کی کمی تھی، اس لیے فوراً مزاح نگاری سے مستعفی ہو گئے۔

املی کو بر سر عام چٹخارے لیتے ہوئے نہیں کھانا چاہیے۔ اس سے دوسروں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ ویسے چھپ کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہمارا لٹریچر املی کے تذکروں سے خالی ہے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی نظریں املی کی طرف ذرا کم کم ہی گئی ہیں۔ ارض دکن میں رہتے ہوئے اور املی کھاتے ہوئے "حق املی" ادا نہ کرنا سراسر زیادتی ہے۔!!

www.taemeernews.com

دسواں سیّارہ: جہیز یار جنگ

"گوری بی بی ! بتا توں ! اب مزا بتا توں !"

ہر روز سرِ شام محلے میں ایک نوجوان کی آواز گونجتی، اور محلے کے سارے لوگ کام دھام چھوڑ کر اس آواز کی طرف لپکتے، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ساری ٹریفک جام ہو جاتی۔ نشے میں دھت اس نوجوان کو دیکھتے ہی محلے کے بعض منچلے پکار اُٹھتے:

ارے آ گیا! دلاور خان آ گیا! جہیز یار جنگ آ گیا!"

لڑکوں کا یہ فقرہ جلتی پر تیل کا کام کرتا، اور دلاور خان بھڑک کر بڑی تیزی سے ایک جست لگاتا اور دوسرے ہی لمحے میں وہ اپنے گھر کی دہلیز پر ہوتا۔ وہاں پہنچ کر وہ پھر وہی صدا بلند کرتا:

"گوری بی بی! اِدھر آ، میں آ گیا ہوں! اب بتا توں !"

یہ سُن کر گوری کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا، اور وہ کڑھ کر رہ جاتی کہ اس کے والدین نے اس کی شادی ڈھیر سارا جہیز دے کر ایک اُجڈ اور گنوار سے کیوں کی؟ وہ بادل ناخواستہ گھونگھٹ ڈالے رسوئی گھر سے نکلتی اور شرماتی لجاتی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی صحن میں آ کھڑی ہوتی ایکو اس بات کا دھڑکا لگا رہتا کہ دیر ہو جائے گی تو اس کا شوہر اسے پیٹا دے گا۔ صحن میں آنے کے

www.taemeernews.com

بعد جیسے ہی اس کی نظر باہر کھڑے مجمع پر پڑتی تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی. لیکن دلاور خاں کو قطعی شرم نہ آتی۔ وہ اپنی نئی نویلی دلہن کو صحن میں کھڑی دیکھ کر بے ساختہ جھوم اُٹھتا اور پھر اس سے پوچھتا:

"گوری بی بی! اب بتائیں کون ہوں؟"

وہ سوال کا جواب نہیں دے پاتی۔ کیوں کہ اس پر نسوانیت اور حیا غالب آجاتی ــــ یوں بھی ہندوستانی بیوی اپنے شوہر کا نام لینا کب پسند کرتی ہے۔ بہت ہی اصرار ہوا تو صرف اتنا کہے گی:

"اُون! ہمارے اُون! ہمارے "وہ"!"

گوری کی خاموشی کو دیکھ کر دلاور خاں پر گالیوں کا دورہ پڑتا۔ پھر بھی گوری ٹس سے مس نہ ہوتی۔ یہ دیکھ کر بڑی بوڑھیاں اسے جھنجھوڑتیں:

"اری بیٹی بول! کچھ تو بول! کچھ نہیں تو 'ہمارے اُون' تو بول!"

اس پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوتی۔ اس کی خاموشی اس بات کا احتجاج ہوتی کہ دلاور خاں نے اس سے شادی نہیں کی بلکہ جہیز سے شادی کی ہے!

یہ تماشا روز کا معمول بن گیا تھا!

چنانچہ جب ایک دن دلاور خاں نے حسبِ معمول وہی رٹ ــــ 'میں کون ہوں؟' کی لگائی تو گوری سے رہا نہ گیا۔ بالآخر اس نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا:

"آپ جہیز یار جنگ ہیں، جہیز یار جنگ!"

اس طنزیہ فقرے پر کوئی اور نوجوان ہوتا تو وہ وہیں زمین میں گڑ جاتا۔ لیکن دلاور خاں نے اپنا سینہ ٹھونک کر بڑے فخر سے کہا:

"ہاں! ہم جہیز یار جنگ ہیں، جہیز یار جنگ!"

www.taemeernews.com

اس واقعہ کو گزرے ہوئے کوئی چالیس سال ہو چکے ہیں ۔ ہم اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں ۔ یہی نہیں ہم نے اس جہیز یار جنگ کی شادی میں بہ نفس نفیس شرکت کی تھی اور " چوتھی ڈنر " میں نوشہ کو ہم طعامی اور ہم کلامی کا شرف بخشا تھا ۔ اس کے علاوہ جہیز کو ملاحظہ فرمانے کی سعادت بھی حاصل کی تھی ۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جہیز کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ہماری نیت ڈانواں ڈول ہو گئی تھی ۔ اور ہماری مجرد زندگی کو " زن مریدی " سے کہیں زیادہ " زر مریدی " کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا ۔ یوں بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ شادیوں کے موقع پر جہیز کی کچھ اس طرح نمائش کی جاتی ہے کہ نوجوانوں کا جہیز نہ لینے کا عہد متزلزل ہو جاتا ہے ۔ یہی نہیں بعض شادی شدہ حضرات کو عقد ثانی کی فکر لاحق ہو جاتی ہے ۔

ہم نے یہ چالیس سالہ پرانا واقعہ محض اس لیے سنایا کہ ہمارے نوجوان صبر بکڑیں اور " زر " کی بجائے " زن " سے شادی کریں ۔ چالیس سال پہلے ہم نے صرف ایک گوری کو پٹتے اور گالیاں کھاتے دیکھا تھا ۔ لیکن آج کل جہیز اور " جوڑے کی رقم " کے نام پر کئی گوریاں پٹ رہی ہیں گالیاں کھا رہی ہیں اور جلائی جا رہی ہیں ۔ پتہ نہیں ہمارے نوجوانوں کی حمیت کو کیا ہو گیا ہے ؟! ــــ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب نوجوان اپنی پسند کی گوری کو حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیا کرتے ۔ سوئمبروں میں شریک ہوتے ، اور اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے ۔ مختصر یہ کہ گوری کو حاصل کئے بغیر ان کو چین نہ آتا ۔ اس کے برعکس آج کے نوجوانوں کو لیجیئے ۔ ان کی نظریں دلہن کے بجائے جہیز کے سامان پر جمی رہتی ہیں ۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بڑا درد انگیز ہے کہ ایک شادی کے موقع پر عقد کے بعد جب دلہا سے یہ پوچھا گیا کہ " صاحبزادے تم لڑکی کو کہاں رکھنا پسند کرو گے ؟ اپنے ماں باپ کے گھر میں یا

www.taemeernews.com

یا کوئی مکان کرایہ پر لے کر . . . !"

اس پر لڑکے نے اپنے خُسر کو یہ جواب دیا کہ "قبلہ! آپ اپنی لڑکی کو اپنے پاس ہی رکھ لیجئے! البتہ جہیز مجھے دے دیجئے !" دیکھا آپ نے کہ زر پرستی اور زن مریدی نوجوانوں کو کہاں سے کہاں لے گئی ہے؟ اس زر پرستی سے تو زن مریدی اچھی کہ کم از کم شرفا کی عزت تو نیلام نہیں ہوتے پاتی۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے زمانے میں لڑکی والے اپنے داماد کو جہیز نہیں دیتے تھے؟ ضرور دیتے تھے مگر حسبِ حیثیت۔ ان کی فراخ دلی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ اگر جہیز کی فہرست میں کچھ چیزیں شامل ہونے سے رہ جائیں تو ان کی لکھائی پڑھائی، کرلی جاتی اور باضابطہ ادھار کھاتہ کھول دیا جاتا۔ اس طرح داماد کو وعدۂ فردا پر ٹال دیا جاتا۔ ٹال کیا دیا جاتا بلکہ ٹرخا دیا جاتا۔ یہیں سے خوشدامن کے روپ میں لڑکی کی ماں کے رول کا آغاز ہو جاتا۔ وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنا رول نبھاتی اُس دَور کی خوش دامنیں بڑی چالاک اور ہوشیار ہوا کرتی تھیں شادی کے بعد وہ اپنے دامادوں کو نہ جانے کیا گھول کر پلاتیں یا ٹوٹکے کرواتیں کہ داماد اپنی نئی نویلی بیوی کے چکر میں پڑ کر نہ صرف ما بقی جہیز کے مطالبے کو بھول جاتے بلکہ اپنے ماں باپ تک کو بھول جاتے۔ نتیجتاً لڑکے کے والدین اپنے لڑکے پر زن مریدی کا لیبل لگا کر کفِ افسوس ملتے ہوئے یہ فرماتے کہ "ہمارا لڑکا تو اب ہاتھ سے گیا!" مختصر یہ کہ خوش دامن اپنے داماد کو کچھ ایسی ہوا دیتی کہ سرکش سے سرکش داماد کسی سرکس کے سدھائے ہوئے جانور کی طرح ساس کے اشاروں پر ناچنے لگتا۔ پتہ نہیں وہ خوشدامنیں کہاں گئیں، اور کیوں ناپید ہو گئیں؟ ہو سکتا ہے کہ ساس کے اُن پُرانے نسخوں میں اب کوئی جان باقی نہ رہی ہو۔ یا یہ بھی عین ممکن ہے کہ آج کل کے نوجوانوں کے معدے ہی اس قابل نہ رہے ہوں کہ وہ ساس کے آزمودہ نسخوں کو پچا سکیں۔

www.taemeernews.com

"جہیز کا مسئلہ کوئی آج کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بڑا پرانا اور گمبھیر مسئلہ ہے اس کی جڑیں ہمارے سماج میں بڑی اندر تک مضبوطی کے ساتھ پھیلی ہوئی ہیں۔ ان جڑوں کو اکھاڑ پھینکنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ بڑے بڑے مصلحین نے بڑی کوششیں کیں کہ ان جڑوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں لیکن ان کوششوں میں وہ خود اس جہانِ فانی سے اٹھ گئے اور جہیز کا مسئلہ جوں کا توں باقی رہا۔

دُلہا والوں کے بے تکے مطالبات کے پیش نظر تلگو کے مشہور ادیب چلکامرتی نے آج سے پون صدی پہلے ہی داماد کو ایک عجوبہ قرار دے کر اس کو "دسواں سیارہ" کے خطاب سے نوازا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے سماج میں کوئی بھی طبقہ ایسا نہیں رہا جس کی لڑکیاں جہیز اور "جوڑے کی رقم" کی بھینٹ نہ چڑھتی ہوں۔ اب آپ ہی غور کیجئے کہ دسواں سیارہ، داماد نظام شمسی والے نو سیاروں سے کتنا زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

ہم کوئی ماہرِ فلکیات تو ہیں نہیں کہ نظام شمسی سے وابستہ نو سیاروں مریخ، مشتری، زحل اور زہرہ وغیرہ کے بارے میں معلومات پیش کریں اور نہ ہم کوئی ماہرِ علمِ نجوم ہیں۔ ہاں، ہم اس حد تک ضرور قصور وار ہیں کہ ہمارے نام کا ایک جُز "انجم" ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کونسا سیارہ اور کونسا ستارہ انسانی زندگی پر کس قدر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ ساری باتیں ماہرِ فلکیات اور ماہرینِ نجوم جانیں البتہ دسواں سیارہ "داماد" کے بارے میں ہمارے پاس اتنی ساری معلومات ہیں کہ ہم بڑی آسانی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے ایک مقالہ قلم بند کر سکتے ہیں۔ ہے کوئی داماد کا مارا خسر جو ہم سے یہ خدمت مستعار لے سکے۔!

www.taemeernews.com

دسواں سیّارہ ، داماد، نو سیّاروں سے مختلف ہوتا ہے ۔ یہ رہتا تو زمین پر ہی ہے لیکن دامادی رشتے سے منسلک ہوجانے کے بعد اچانک اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی سابقہ گردش اور سابقہ روش یکلخت بدل دیتا ہے۔ اس کے نام کی خوبی یا خامی یہ ہے کہ ——— "نادان ، کو الٹا بھی تو نادان رہا" کے مصداق "داماد" کو اُلٹ دیں تو 'داماد' ہی رہے گا۔ سیدھا بھی 'داماد' (دام اد = داماد) اُلٹا بھی 'داماد' ۔ چت بھی اسی کی ۔ پٹ بھی اسی کی! اس معاملے میں لنگڑے، لولے، اندھے، کانے، جاہل، نیم جاہل، کاہل، ان پڑھ، تعلیم یافتہ ڈگری ہولڈر اور ویزا ہولڈر وغیرہ کی کوئی قید نہیں۔ داماد سارے کے سارے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں ۔

نو سیّاروں کا مرکز سورج ہوتا ہے۔ تو دسواں سیّارہ 'داماد' کا مرکز اس کی سسرال ہوتی ہے ۔ اور اس کی نظریں ہمیشہ سسرال کی جائداد اور مال پر لگی رہتی ہیں۔ جب تک اس کو "سلامیوں" اور تحفوں کے عنوان سے خیر خیرات ملتی رہتی ہے وہ امن اور چین سے رہتا ہے۔ جیسے ہی یہ سرچشمہ بند ہوجاتا ہے وہ ایک دم اپنی روش اور چال بدل دیتا ہے اور مار توڑ اور گالی گلوج پر اُتر آتا ہے۔ اس کو یہ پسند نہیں کہ لڑکی والے چین اور سکون کی زندگی گزاریں۔ بالآخر وہ سسرال والوں کو لنگوٹی لگا کر چھوڑتا ہے ۔ اتنی بڑی لوٹ کھسوٹ کے بعد لڑکی والوں کے گھر چوری کا کوئی کھٹکا نہیں رہتا۔ اصولاً ہر شادی کے اختتام پر لڑکی والوں کو ایک پر گیت کا یہ مکھڑا دہراتے رہنا چاہیئے :

ہمیں تو لوٹ لیا مل کے دُولہا والوں نے\
دل کے اُجالوں میں، مَن کے کالوں نے

www.taemeernews.com

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

خُدا، حمایت بھائی کے قد کو اور لمبا کرے، کئی خوبیوں کے حامل ہیں۔ اُن میں ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ہماری ذات میں پوشیدہ صلاحیتوں کو تلاش کیا کرتے ہیں۔ اور جہاں کہیں کوئی ادبی میدان یا گنڈہ یا گڑھا ہماری پوشیدہ صلاحیتوں کے عین مطابق میل کھاتا نظر آتا ہے تو وہ فوراً ہمیں آگے بڑھا دیتے ہیں۔ بڑھا کیا دیتے ہیں، بلکہ ڈھکیل دیتے ہیں۔ ایک بار انھیں ہماری ذات میں ایک تلگو پنڈت چھپا نظر آیا۔ ہماری تلگو دانی کا امتحان لینے کے لیے ایک چھوٹی سی دُکان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "اس دُکان والی سے تلگو میں پوچھ تو سہی کہ انڈے ہیں؟" ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ! اپنی تلگو دانی کا رعب جمانے کے لیے دکان میں بیٹھی ہوئی سیٹھانی سے پوچھا: "అమ్మగారూ! మీ వద్ద కోడి గుడ్లు దొరుకుతాయా?"
(اے ماں جی! کیا آپکے پاس انڈے ملتے ہیں!؟) سیٹھانی نے غصّے کے عالم میں، مارنے کیلئے باٹ اٹھاتے ہوئے پوپلے منہ سے کہا کیوں رے جانا نہیں یہاں سے! تیرے منہ میں مٹی پڑے! کیا تجھے ہماری دکان میں انڈے نظر آرہے ہیں "داڑھیال"؟ ہم تو ویجیٹیرین ہیں "ویجیٹیرین"! وہ تو اچھا ہوا کہ ہم فوراً ایک گلی میں بھاگ گئے۔ ورنہ فساد کی بنیاد کے لیے تو "ویجیٹیرین" اور "نان ویجیٹیرین" کا پہلا پتھر پڑ ہی چکا تھا صرف نعرہ بلند ہونے کی دیر تھی۔

پھر یوں ہوا کہ کافی طویل عرصے کے بعد زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقاریب

www.taemeernews.com

کے موقع پر ملت بھائی کو ہماری ذات میں ایک کنوینر چھپا نظر آیا۔ حسب عادت فوراً ہمیں آگے بڑھادیا۔ یعنی ڈھکیل دیا۔ ہم یہ سوچ کر خاموش ہو رہے کہ ہمارے شہر کی روایت کے مطابق عین موقع پر ہماری کمر پکڑنے کے لیے باہر سے کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا، COMPERE (کمپیر) کے روپ میں۔ ہم تو یہی دیکھتے آئے ہیں کہ آل انڈیا قسم کے مشاعرہ کے موقع پر جب پروگرام کی کمپیرنگ کا وقت آجاتا ہے تو اسٹیج پر کنوینر کی جگہ کمپیر نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ شخص ہوتا ہے جسے باہر سے بُلایا جاتا ہے۔ اور وہ شاعروں کو گراہ کرنے کا معقول معاوضہ بھی لیتا ہے۔ یوں بھی مقامی لوگوں کو ترجیح نہ دینا ہمارے شہر کی بڑی قدیم روایت رہی ہے۔ حتیٰ کہ فسادات کے موقع پر غنڈوں تک کو باہر سے بلایا جاتا ہے۔ جبکہ یہاں ایک سے ایک باصلاحیت غنڈہ موجود ہے۔ جب باہر کے غنڈے لوٹ مار مچا کر فرار ہو جاتے ہیں تو پولس مقامی غنڈوں پر طبع آزمائی کرتی ہے۔ ہمیں باہر سے کمپیر، شاعر، ادیب اور دانشور وغیرہ کو بلائے جانے پر قطعی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ شوق سے بلائیں۔ جوق در جوق بلائیں۔ ہمیں تو صرف "بیرونی سیاست" اور باہر کے غنڈوں کو بلائے جانے پر اعتراض ہے۔

تمہید قدرے طویل ہوگئی ہے لیکن یہ اتنی طویل طویل بھی نہیں کہ کسی لیڈر پر لگائے گئے جرائم کی تفصیل معلوم ہو۔ ہاں، تو ہم اپنے کنوینر بنائے جانے کی بات کر رہے تھے۔ زندہ دلان نے ہمیں ادبی اجلاس کا کنوینر مقرر کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی یہ مژدۂ روح فرسا بھی سُنا دیا تھا کہ پروگرام کی کمپیرنگ کا فریضہ بھی ہمیں ہی انجام دینا ہوگا۔ البتہ نذرانہ کی پیش کشی کے لیے ادبی اجلاس کے کامیاب اختتام کی شرط عائد کر دی تھی۔ خیر ہم "مرتا کیا نہیں کرتا" کے مصداق کاغذی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ ہم نے مزاح نگاروں کا کچا چٹھا جمع کرنا شروع کر دیا۔ یعنی یہی کہ کون مزاح نگار رہا ہے۔

www.taemeernews.com

کب پیدا ہوئے ؟۔۔۔ ان کی صحیح تاریخ پیدائش کیا ہے ؟۔۔۔ اپنی عمر کو جاننے میں کتنے سال کی ڈنڈی مارتے ہیں ؟۔۔۔ اور یہ عمل کب سے جاری ہے ؟۔۔۔ ادب میں کیوں آئے ہیں ؟۔۔۔ اور کس دروازے سے تشریف لائے ہیں ؟۔۔۔ اور کب تک قیام فرمانے کا ارادہ ہے ؟ ادب کے میدان سے ادب کے سامنے سبکدوش ہوتے بھی ہیں یا نہیں ؟ یا پھر پچیس سالہ مدت ملازمت کی طرح کوئی ORDINANCE (آرڈیننس) جاری کروانا پڑے گا۔ یا پھر بھگانے کے لیے جشن کی دھمکی دینی پڑے گی مضامین کے ذریعہ منناتے ہیں ؟ یا سامعین کو گدگدیاں کرنی پڑتی ہیں۔

یہ سارے انکشافات مزاح نگاروں کے حق میں دکھتی رگوں کی نوعیت کے تھے جن کو ٹٹولنا گویا ہمارے حق میں بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے برابر تھا۔ یوں بھی کمپیئر کا فریضہ نامسعود یہ ہوتا ہے کہ وہ مدعو شعرا یا ادباء کو خوش فہمی میں مبتلا اور گمراہ کرنے کی پالیسی اختیار کرے۔ جو کمپیئر جتنا زیادہ گمراہ کرے گا، وہ اتنا ہی کامیاب کمپیئر قرار دیا جائے گا۔ اردو کے معاملے میں بھی ایسی ہی پالیسی اختیار کی جاتی ہے جسے "پالیسی برائے ترقیٔ اردو" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے کمپیئرنگ کے اس جائز حق سے استفادہ کرتے ہوئے سارے مدعو مزاح نگاروں کو خوش کرنے اور ایک ہی صف میں لانے کے لیے پوری ٹیم (TEAM) کی عمروں کا اوسط نکالا۔ جس کے نتیجہ میں سارے بوڑھے مزاح نگار کاغذ پر جوان ہو گئے۔ البتہ ہم نے خاتون مزاح نگاروں کو اس کلیہ سے مستثنیٰ رکھا تاکہ ان کے شوہروں کی حوصلہ شکنی نہ ہو اور ازدواجی تعلقات خوشگوار رہیں۔

ان امور سے فراغت پانے کے بعد کمپیئر کی حیثیت سے اپنا جائزہ لینا شروع کیا کہ آخر ہم اس منصب پر کس حد تک کھرے اترتے ہیں ؟۔۔۔

www.taemeernews.com

کمپیئر کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی آواز قدرے رعب دار ہو۔ اگر آواز میں سیکس اپیل ہو تو پھر کیا کہنے! سارا پروگرام کامیاب۔ امیتابھ کی فلمیں اس لیے کامیاب ہوتی ہیں کہ ان کی آواز میں سیکس اپیل ہے۔ یہ ہمارا نہیں، فلمی نقادوں کا خیال ہے۔ کامیاب کمپیئرنگ کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ کمپیئر کی بتیسی اصلی ہو۔ اور وہ صحیح و سالم بھی رہے۔ تاکہ الفاظ صاف نکلیں اور ہوا خارج نہ ہو۔ تیسری شرط یہ کہ کمپیئر بے تکان بولنے والا ہو۔ حالات چاہے کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہوں وہ بس بولتا ہی رہے۔ اور اس کی بولتی بند نہ ہونے پائے۔ کامیاب کمپیئرنگ کے لیے سب سے اہم شرط یہ ہے کہ کمپیئر مشاعرہ کے اختتام تک "سو سنار کی تو ایک لوہار کی" کے فارمولے پر عمل کرتا رہے۔ یعنی کہ جیسے ہی سنار (یعنی شاعر) اپنا کلام سنا کر مائک سے ہٹے، وہ ایک لوہار (یعنی کمپیئر) ایک پھڑک دار لطیفہ سنا کر ساری شعری فضا کو تہس نہس کر دے تاکہ آخر تک اسی کا بول بالا رہے۔

ان تنقیحات کی روشنی میں کمپیئر کی حیثیت سے جب ہم نے اپنا جائزہ لیا تو خاصی مایوسی ہوئی۔ یہاں ہمیں اس بات کا اعتراف کر لینے دیجئے کہ سرکاری اعداد و شمار کے اعتبار سے ہم اپنے ملک کی اوسط عمر کو پار کر چکے ہیں۔ اور اپنے ہی ظرف اور حوصلے کے بل بوتے پر "کشتر" میں جی رہے ہیں۔ اگر ہماری عمر میں سے فسادات اور کرفیو کی مدت منہا کر دی جائے تو ہماری حیثیت اُس شیر خوار کی سی ہو جائے گی جو پنگوڑے میں پڑا انگوٹھا چوس رہا ہو۔ چنانچہ ہمیں از سرِ نو زندگی کا آغاز کرنے کے لیے پچاس برس بطور بونس ملنے چاہئیں جبکہ اس معاملے میں خدا بالکل بری الذمہ ہے۔

جب صورتِ حال اتنی پیچیدہ ہو تو غور فرمائیے ہمارے اعضائے رئیسہ کا کیا حال ہوگا؟ یوں تو کہنے کو اصلی بتیسی موجود ہے۔ لیکن پوری طرح صحیح و سلامت

www.taemeernews.com

نہیں۔ اس کے بعض "پلر" گر چکے ہیں۔ چنانچہ "تپسی" اب "تپسی" میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔ لہذا بات کرتے وقت بعض الفاظ پھڑپھڑا کر نکل جاتے ہیں۔ اور "شین" "قاف" صحیح طور پر ادا ہو نہیں پاتے یوں تو کہنے کو آواز معقول سی پائی ہے۔ لیکن وہ مائک کی تابع نہیں رہتی۔ اب ہم کہاں تک اپنی کوتاہیوں کو گنائیں لیکن ان تمام کوتاہیوں کے باوجود جلسہ کی کارروائی بہرحال ہمیں ہی چلانی تھی۔ ویسے ہم نے یہ پلان ضرور بنا رکھا تھا کہ حالات موافق اور سازگار رہوں تو ہی ادبی اجلاس کی کارروائی چلائیں گے۔ ورنہ ہم خود چل دیں گے۔ جس طرح دیہات کے ایک خود ساختہ امام صاحب نے مسائل سے عدم واقفیت کی بنا پر مقتدیوں کو سجدہ میں رکھ کر راہ فرار اختیار کی تھی۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ جلسہ کی کامیابی کے لیے اناؤنسر کی آواز کی موزونیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ہم اسکیم کے مطابق جلسے کے روز دوپہر سے سہ پہر تک خوب سوتے رہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ آدمی جب دوپہر میں خوب سو کر اُٹھتا ہے تو اس کی آواز میں ایک عجیب طرح کا لوچ اور سکیس اپیل گھنٹے دو گھنٹے کے لیے کہیں سے آ جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سہگل، ایس۔ ڈی برمن اور مکیش جیسے گلوکار جو دھیمے سُروں میں گایا کرتے تھے، اپنے سارے ہٹ (HITS) گانے دوپہر میں سو کر اٹھنے کے بعد ہی ریکارڈ کروائے ہوں۔ چنانچہ جب ہم سو کر اُٹھے تو ہماری آواز میں ایک عجیب طرح کا کھرج تھا VOICE TESTING کے لیے اپنی اٹھتی جوانی کے دور کے ایک پسندیدہ فلمی گانے کا یہ ٹکڑا گنگنایا:

ع دھیرے سے جانا بگین میں، بھونرا

آواز قدرے اونچے سُروں میں جاتی محسوس ہوئی جسے "بٹھانا" نہایت ضروری تھا۔ لہذا

www.taemeernews.com

ہم اپنی آواز کو بٹھانے کے طریق کار پر غور کرتے رہے۔ ہم نے اپنے ایک شاعر دوست سے یہ سن رکھا تھا کہ آواز کو بٹھانے کے لیے مشروبات سے زیادہ موزوں کوئی اور شئے دریافت نہیں ہوئی ہے۔ جس شاعر سے ہم نے مشروب والی بات سُنی تھی وہ ایک تشریع قسم کے شاعر ہیں۔ اور شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ البتہ مشاعرہ کے روز جب ان کے شاعر دوست یک گونہ بے خودی کو پانے کے لیے بادہ نوشی کا سہارا لیتے ہیں تو ہمارے دوست FOR THE SAKE OF "تم COMPANY" لیکا سے استفادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اسی مشروب سے استفادہ کرنے کی غرض سے بازار سے "لیکا" منگوایا اور بیوی کو حکم دیا کہ وہ فوراً ڈبل چھالیہ اور پودینہ کا ایک پان بنا دے۔ بیوی نے ان غیر شاعرانہ حرکتوں کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا "گھر بیٹھے یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

ہم نے جواب دیا "ذرا آواز کو بٹھا رہا ہوں!"

محترمہ نے فرمایا "ہائے ہائے! اس عمر میں آواز کو کیوں بٹھاتے ہو؟ اب آپ کے پاس یہی تو ایک چیز کھڑی ہوئی ہے۔ اگر رہی سہی آواز بھی بیٹھ جائے تو پھر مجھ پر اور بچوں پر کس طرح بھونک سکیں گے۔ اگر آواز کو بٹھانا ہی ہے تو کورے گھڑے کا پانی پیجیئے آواز بھی بیٹھ جائے گی اور گھر میں نیا گھڑا بھی آ جائے گا"!

ہم بیوی کے اس ملٹی پرپز (MULTIPURPOSE) مشورے پر دھیان دیئے بغیر "لہرا کے پی گیا" کے مصداق غٹا غٹ لیکا پی گئے۔ اور پھر بیوی کے مبارک ہاتھوں سے بنی گلوری چبائی۔ بس یہیں سے ہماری تباہی کے آثار شروع ہو گئے۔

ہم نے بیوی کو ڈبل چھالیہ اور پودینہ کے پان کا حکم دیا تھا۔ لیکن نیک بخت نے ڈبل چھالیہ کے ساتھ پودینہ بھی ڈبل کر دیا تھا۔ یہ تو پان کھانے والے بخوبی جانتے

www.taemeernews.com

ہیں کہ جب پان میں پودینہ کی مقدار ڈبل ہو جاتی ہے تو منہ میں کس غضب کی ٹھنڈی آگ لگ جاتی ہے۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہمارے حلق میں برفیلی ماؤنٹ ایورسٹ آ کر بیٹھ گئی ہے اور چاروں طرف ایرکولرز (AIR COOLER) کھل گئے ہیں۔ ہم نے بیوی کو ڈانٹنے کے لیے منہ کھولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ہوا کا ایک ریلا حلق میں گھس گیا اور فوراً ہمارا منہ بند کر گیا۔ تب ہم نے منہ کو زحمت دینا مناسب نہ سمجھ کر سانس کے سارے نظام کو ناک کے نتھنوں سے رجوع کیا جو پچھلے کئی دنوں سے کوئی خاص کام انجام نہیں دے رہے تھے یا یوں کہیے کہ سرکاری ملازمین بن گئے تھے۔ خدا خدا کر کے جب آدھا گھنٹہ گزر گیا اور حلق میں ماؤنٹ ایورسٹ کی برف پگھل گئی تو جلسہ کی کمپیئرنگ کا خیال آیا۔ آواز کے امتحان کے لیے فلمی گانے کا یہ مکھڑا گنگنایا:

یہاں کون ہے تیرا، مسافر تو جائے گا کہاں؟ ؏

تب ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کھلونے بیچنے والا بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے گھوڑے کے بال اور مٹی کی کٹوری سے بنا "کھلونا" گر گرا پھرا رہا ہو ـــــ "غائیں، غائیں، غائیں، غائیں!" اس "بھربھری" آواز کو سن کر ہمیں سخت تشویش ہوئی کیوں کہ آواز ہمارے منشاء کے مطابق نہیں "بیٹھی" تھی۔ بلکہ منشاء الرحمٰن منشاء کے مطابق بیٹھ گئی تھی۔

چنانچہ ہم اسی بھرائی ہوئی آواز کو لیے جلسہ گاہ پہنچ گئے۔ ... ن بندھی ہوئی تھی کہ ادبی اجلاس کا معاملہ ہے۔ سامعین کی تعداد شرفاء پر مشتمل ہوا کرتی ہے ہم سے ضرور تعاون فرمائیں گے۔

پروگرام کے مطابق منشاء صاحب کی افتتاحی تقریر کے بعد ہمیں مائک پر نمودار ہونا تھا۔ ہم اسٹیج پر مزاح نگاروں کے ساتھ بیٹھے آگے پیش آنے والے

www.taemeernews.com

امکانی خطرات اور ان کے سدباب کے بارے میں غور کر رہے تھے۔ ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ منسٹر صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر کا آغاز کب کیا؟ اور تقریر کب ختم کی؟ ان کی تقریر کے بعد از روئے پروگرام، ہمیں مائک سنبھال کر ادبی اجلاس کی کاروائی کا آغاز کرنا تھا۔ لیکن منسٹر صاحب نے اپنی تقریر ختم کرتے ہی، اچانک ایک مضمون سنانا شروع کر دیا جس کا سارے فسانے میں کہیں ذکر نہ تھا۔ یہ ہمارے حق میں تباہی کا مطلع ثابت ہوا۔ کیوں کہ ادبی اجلاس کا باضابطہ آغاز ہو چکا تھا۔ اور ہماری تعارفی تقریر جو چار صفحات پر مشتمل تھی، اور جس میں بڑے دلچسپ انداز میں مزاح نگاروں کا تعارف کروایا گیا تھا۔ اور جس کے لیے ہم نے اپنی ساری توانائی صرف کر دی تھی بے مصرف کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ منسٹر صاحب کے رخصت ہونے کے بعد کاروائی کا آغاز کہاں سے کریں؟ (تقریر نوٹ کر کے پڑھنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے) جوں جوں منسٹر صاحبؒ اپنے مضمون کے اختتام کی جانب بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے ہم میں اختلاجی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہماری خود اعتمادی بھی رخصتی گیت "چھوڑ بابل کا گھر" گانے لگی تھی۔ اتنے میں وزیر باتدبیر نے اپنا مضمون ختم کیا اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں رخصت ہوئے۔ اور جاتے جاتے ہماری خود اعتمادی اور دو عدد لطیفے بھی ساتھ لیتے گئے۔ یہاں ہم کیوں نہ اس بات کی نشان دہی کر دیں کہ وہ منسٹر صاحب وہی تھے جو عارضی اسپیکر کے فرائض انجام دیتے ہوئے اسمبلی میں اچانک بے ہوش ہو گئے تھے۔ اُس وقت تو وہ ناسازئ مزاج کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے تھے لیکن اب سالم ہوش و حواس کے ساتھ بیہوش ہونے کی ہماری باری آ گئی تھی۔ کیوں کہ ہماری تعارفی تقریر اور دو عدد لطیفوں کے

www.taemeernews.com

مصروف ہوجانے کے بعد ہمارے پاس آموتیش بچا ہی کیا تھا۔ جو ہمارے کام آتا۔ نام کے اعلان کے ساتھ ہی ہم نے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے ہمارا بشرٹ پکڑ کر کھینچا۔ ہم سمجھے کہ شاید کرسی نے ہمارے بشرٹ کو پیچھے سے پکڑ لیا ہے اور وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ آنا چاہتی ہے۔۔۔ "تمہارے سنگ میں بھی چلوں گی پیا جیسے پتنگ پیچھے ڈور"! ہم نے گھوم کر جو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ حرکت ایک مزاح نگار نے کی تھی۔ ہم نے غصیلی نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو ان کی نظروں میں التجا نظر آئی۔ کہا "مجھے پہلے پڑھا دو! لال ٹیکری جانا ہے"! ان کی عجلت اور ہماری ہیبت میں، "ہمیں لال ٹیکری جانا ہے" کی بجائے "لیٹرین جانا ہے" سنائی دیا اب اس کو کیا کیجیے کہ ہماری ضرورت ان کو لاحق ہوتی سنائی دی۔ ہم ان کی بات پر دھیان دیئے بغیر آگے بڑھنا چاہتے ہی تھے کہ سامعین کی پچھلی صف سے ایک آواز سنائی دی "بونتہ"! یہ لفظ "بونتہ" ہمارے ایک پچھلے مضمون کا عنوان تھا، جو ظاہر ہے، ہماری حوصلہ افزائی کے لیے دہرایا گیا تھا۔ مگر یہ ہمارے حق میں ایک سنگ گراں ثابت ہوا ہمارے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ہم نے سوچا کہ یہ ایک نفسیاتی دباؤ ہے اور اس سے بچ نکلنا چاہیے۔ STAGE FEAR کے بارے میں کسی مفکر کا یہ قول پڑھ رکھا تھا کہ مقرر کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو افلاطون یا ارسطو کے قبیل کا ایک فرد سمجھے اور حاضرین کو حشرات الارض۔ اس مفکر کو یہ کیا معلوم کہ تصوری اور پراکٹیکل میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ ویسے، "ہم بچہ" تو نہیں تھے، بلکہ "لور بچہ" تھے لیکن حاضرین بھی تو کوئی بچے نہیں تھے۔ ان میں بھی تو "لور بچے" اور "لور بچیاں" تھیں جن کی تعداد کو ہماری اضطراری کیفیت نے دگنا تگنا کر کے دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اسی اضطراری کیفیت میں ہمارے

www.taemeernews.com

منہ سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا: "اب سارے مزاح نگار اپنے مضامین سنائیں گے"!
پلٹ کر جو دیکھا تو واقعی سارے مزاح نگار مائک کی جانب بڑھتے نظر آئے۔ شاید
انھیں ڈنر میں شرکت کی عجلت تھی۔ ہمیں احساس ہوا کہ اعلان میں کہیں گڑبڑ ہو گئی ہے
مگر اب تو تیر نکل چکا تھا اور سارے مزاح نگار مائک کی طرف بڑھنے لگے تھے جنھیں
دنیا کی کوئی بھی طاقت بٹھا نہیں سکتی تھی۔ ہمیں یاد آیا کہ جب ادیب اور شاعر بے قابو
ہو جاتے ہیں تو انھیں بٹھانے کے لیے چھوٹے اور بڑے کا تنازعہ کھڑا دینا چاہیے۔
چنانچہ ہم نے اسی حربے کو آزمانے کے لیے مائک پر اعلان کیا کہ "سب سے پہلے
سب سے چھوٹے اور سب سے جونیر مزاح نگار اپنا مضمون سنائیں گے جن کے مقام
کا ادب میں ابھی تعین نہیں ہوا ہے"۔ یہ تدبیر بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ پلٹ کر جو دیکھا تو سارے
مزاح نگار اپنی اپنی کرسیوں کی طرف کچھ اس تیزی سے جھپٹتے نظر آئے جیسے میوزیکل
چیرس کے مقابلے میں بچے کرسیوں پر قبضہ کرنے کے لیے لپکتے ہیں شاید انھیں اپنے مقام
کے چھن جانے کا خوف تھا۔ وہ تو بڑا فضل ہوا کہ صدر محترم اور مہمان خصوصی کی کرسیاں
محفوظ رہیں۔ وہ بھی محض اس لیے کہ جناب صدر اور مہمان خصوصی پیرانہ سالی کی وجہ سے
اپنی اپنی کرسی سے اٹھ نہیں پائے تھے! اسی اثناء میں اچانک ہمارے ذہن میں "لیڈیز فرسٹ"
والی بات یاد آگئی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے اعلان کیا کہ "مزاح نگاروں
میں ایک خاتون مزاح نگار بھی ہیں۔ لیڈیز فرسٹ کے اصول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے
ان سے مضمون سنانے کی درخواست کی جاتی ہے"۔ یہ اعلان کر کے ہم پلٹے ہی تھے کہ بدحواسی
کے عالم میں مائک کے تار میں اُلجھ گئے اور اسٹیج پر گر پڑے۔ آنکھیں جو کھلیں تو ہم اپنے
ہی گھر میں بستر پہ پڑے ہوئے تھے۔ البتہ ہمارے چھوٹے صاحبزادے ہمارے پیروں میں

www.taemeernews.com

اُلجھ کر ہم پر گر پڑے تھے۔

ہم اس خواب کے بارے میں بڑی دیر تک سوچتے رہے۔ اس خواب نے ہمیں خاصہ پریشان کر دیا تھا۔ کیوں کہ اس دن شام میں ہمیں ادبی اجلاس کی کارروائی چلانی تھی۔ ہم بہت دیر تک غور کرتے رہے۔ تب یہ بات سمجھ میں آئی کہ بقول فرائڈ انسان کی ادھوری خواہشات اور آرزوئیں خواب میں سر اٹھاتی ہیں۔

اس روز ہم نے کمپیرنگ کے فرائض کس طرح انجام دیئے؟ اور اس کی کامیابی کا صلہ ہمیں کیا ملا؟ یہ ساری تفصیلات بتانے کے لیے ایک اور مضمون لکھنا پڑیگا۔!

□□

www.taemeernews.com

گلشن، پچ اور کرکٹ فیور

گاڑی بان اپنی گاڑی میں دو بیل باندھتا ہے۔ گاڑی کی سیدھی جانب کے بیل کو "گلشن" کہتے ہیں۔ اور بائیں جانب کے بیل کو "پچ"۔[1] "گلشن" ذرا تیز گام ہوتا ہے، اور "پچ" قدرے کمزور۔ اگر "پچ" بالکل ہی پچ قسم کا ہو تو "گلشن" پر گاڑی کا لوڈ (LOAD) بڑھ جاتا ہے۔ اور گاڑی کی رفتار سُست ہو جاتی ہے۔ لیکن گاڑی بہرحال لڑکھڑاتی، سنبھلتی، کسی نہ کسی طرح منزلِ مقصود کو پہنچ جاتی ہے۔ اس کے برعکس "گلشن" اور "پچ" دونوں کے دونوں تیز قسم کے ہوں (جو عموماً نہیں ہوتے) تو گاڑی کو خطرہ لاحق رہتا ہے۔ پتہ نہیں، راستے میں کب کوئی گڑھا یا کھڈ آجائے، اور گاڑی اُلٹ جائے۔ خواہ کچھ ہو، ہوشیار گاڑی بان "گلشن" کو "پچ" کی جگہ اور "پچ" کو "گلشن" کی جگہ باندھنے کی غلطی کبھی نہیں کرتا۔!

ازدواجی معاملات میں بھی شوہر کی حیثیت "گلشن" کی سی ہے، اور بیوی کی حیثیت "پچ" کی۔ اگر "پچ" بالکل ہی پچ قسم کی ہو تو "گلشن" کو گلچھرے اُڑانے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ چنانچہ ہوشیار شوہر "پچ" کو "گلشن" بننے کی اجازت کبھی نہیں دیتا۔ اور نہ "گلشن" بنانے کی حماقت کرتا ہے۔ اگر "پچ" از خود "گلشن" بننے کی کوشش کرے تو گھر میں "پچ پچ" شروع ہو جاتی ہے۔

---

[1] اسے "گلزار" بھی کہتے ہیں۔

www.taemeernews.com

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ ہماری بیگم ذرا پنج قسم کی واقع ہوئی ہیں۔ لیکن اِدھر جب سے ہم کالونی میں رہنے لگے ہیں، ان کا سابقہ "گلشن" قسم کی بیویوں سے پڑا ہے۔ لہٰذا وہ چاہتی ہیں کہ ہم انھیں "پنج" سے "گلشن" بنا دیں۔ چنانچہ ان کی روزانہ کی 'پنج پنج' سے عاجز آکر ایک دن ہم نے کہہ ہی دیا کہ "بیگم! جہاں تم نے ربع صدی "پنج" کے طور پر گزار دی ہے، وہیں بچے کھچے چند سال اسی ڈھب پر گزارنے میں کیا حرج ہے؟ تم نہیں جانتیں کہ گلشن بننا اور گلشن بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں پیسہ بھی بہت خرچ ہوتا ہے اور محنت بھی بہت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ اور تم تو اس معاملے میں ایک دم پنج ہو!"

بولیں "آپ کو تو بس باتیں بنانا آتا ہے۔ "گل شن" بنانا نہیں آتا۔ ٹی۔ وی۔ لا دو۔ میں ٹی۔ وی دیکھ کر خود بخود "گلشن" بن جاؤں گی"!

بیوی کی ہٹ پر ہمیں ایک دانا کا قول یاد آیا:

"جو شخص عورت کی خواہش کے رُخ کو بزور قوت بدلنا چاہے وہ پرلے درجے کا بیوقوف ہے!"

پھر تو ہم بیوی سے گھبرا کر بازار سے ایک ٹی۔ وی۔ اقساط پر خرید لائے لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ٹی وی کے ساتھ ساتھ کرکٹ فیور (CRICKET FEVER) بھی ہمارے گھر میں داخل ہوگا۔ ہم نے تو صرف ٹی۔ وی سٹ خریدا تھا، کرکٹ فیور نہیں خریدا تھا۔ بلکہ "ریلائنس ورلڈ کپ" کے مقابلوں نے اس فیور (FEVER) کو ہمارے گھر کا پتہ بتا دیا تھا۔ یوں بھی ہمارے گھر میں کرکٹ فیور کو پھیلانے کے لیے ایک نہیں، تین کھلاڑی موجود ہیں جو گلی کے "نکڑ کرکٹ کلب" یعنی این سی سی N.C.C کے لیے کھیلتے ہیں، اور "ایک اوور (OVER) تین جھگڑے" کے اوسط سے

www.taemeernews.com

جھگڑے زیادہ اور رن (RUN) کم بنلتے ہیں بشکر ہے کہ گھمسان کے رن کی نوبت نہیں آتی۔ ذرا ان تین کھلاڑیوں کا حال بھی سُن لیجیے ــــ! ان میں سے ایک وکٹ کیپر ہے جس کے پاس گلوز نہیں ہیں۔ اور وہ فیلڈنگ کے وقت اپنی ہوائی چپلوں کو ہاتھوں میں پہن کر وکٹ کیپنگ کرتا ہے۔ اس سے اگر کوئی یہ پوچھے کہ "میاں! یہ بھی کوئی وکٹ کیپنگ کا طریقہ ہے"؟ تو وہ جواب دے گا کہ "یہ بات آپ انڈیا کے مشہور وکٹ کیپر کرمانی صاحب سے پوچھئے! وہ تو بچپن میں اپنے ہاتھوں میں اینٹیں پکڑ کر وکٹ کیپنگ کیا کرتے تھے"!

دوسرا اسپن بولر ہے جو سڑک پر چلتے وقت بھی گگلی بولنگ کی مشق کرتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ حالتِ نیند میں بھی وہ اپنے ہاتھ چلاتا رہتا ہے۔ گویا ہر وقت ایکشن میں رہتا ہے۔

تیسرا بزعمِ خود ایک مایہ ناز فیلڈر ہے، جس کا شاید ہی کوئی پتلون صحیح و سلامت رہا ہو۔ ان کے پاس پیڈ (PAD) تو کجا، کیپ (CAP) تک نہیں ہے، جس کی تلافی وہ کپڑے کی تھیلیوں سے کر لیتے ہیں۔ نتیجتاً بازار کو جاتے وقت سودے کی تھیلیوں کو ان کے سروں پر ڈھونڈنے کی نوبت آتی ہے۔ یہ ہے ہمارے گھر کا کرکٹ بیک گراؤنڈ! اور ایسے بیک گراؤنڈ میں ہم ٹی وی کے ساتھ ساتھ کرکٹ فیور بھی خرید کر لائے۔

وہ بیوی جس نے اپنا بچپن صرف ایک "انڈور گیم" "چلّیں" کھیلنے میں بتایا تھا اور جو بدیسی کھیلوں اور انگریزوں کو کوسنے میں ماہر سمجھی جاتی تھی، ٹی وی کے آتے ہی کرکٹ میں دل چسپی لینے لگی اور اس دل چسپی کو ریلائنس ورلڈ کپ کے مقابلوں نے اور بھی ہوا دی۔ پھر کیا تھا۔ امورِ خانہ داری کی جگہ کرکٹ نے لے لی، اور ایک

www.taemeernews.com

شامل تھر، اچھے خاصے کرکٹ کلب میں تبدیل ہوگیا۔ بچے نیند سے بیدار ہوتے ہی اسکول جانے کی تیاریاں کرنے کی بجائے کرکٹ پریکٹس میں مگن رہنے لگے، اور بیگم کرکٹ کی باریکیوں پر غور کرنے میں مصروف!

پہلے جب صبح ہوتی تھی تو "بچ" کو "گلشن" کے ناشتے کی فکر ہوتی تھی۔ لیکن اب بیگم روزانہ ناشتے میں پراٹھے اور آملیٹ کی بجائے کرکٹ کی اصطلاحات پیش کرنے لگیں۔ ہماری بیگم کو کرکٹ کی صرف ایک اصطلاح "باؤنڈری" یاد تھی۔ کیوں کہ انہی دنوں گھر کی باؤنڈری وال کی تعمیر کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ ظاہر ہے، صرف ایک اصطلاح کے سہارے کرکٹ جیسا گھنٹوں کھیلا جانے والا کھیل سمجھا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ بیگم نے کرکٹ کی مزید اصطلاحوں کو جاننے اور اس کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں تنگ کرنا شروع کیا۔ یہاں کیوں نہ ہم یہ اعتراف کرلیں کہ کرکٹ کے بارے میں ہماری معلومات صرف "چوا" "چھکا" "باؤنڈری اور سنچری" تک ہی محدود رہیں۔ جب بھی ہم نے ٹی۔ وی کیمرہ اور کمنٹیٹر کی مدد سے کرکٹ کی باریکیوں کو سمجھنے اور فیلڈ پوزیشن کو جاننے کی کوشش کی تو کیمرہ نے کچھ بتایا اور کمنٹیٹر کچھ اور بڑبڑا کر رہ گیا۔ ہم آج تک یہ سمجھ نہ سکے کہ فاسٹ بولر کا ساتھ دینے والی "پچ" اچانک اسے ہاتھ دے کر کس طرح اسپین بولر کا ساتھ دینے لگتی ہے۔ (جیسا کہ ہمارے کمنٹیٹر اکثر بتاتے رہتے ہیں) گویا "پچ" نہ ہوئی، طوائف ہوئی! خیر "پچ" کو چھوڑیئے، ذرا "فیلڈ پوزیشن" کی طرف آئیے۔ جب ہم نے "گلی" پوزیشن کے بارے میں ایک مقامی کرکیٹر سے یہ وضاحت چاہی کہ وہ فیلڈ میں کہاں ہوتی ہے اور کس نوعیت کی ہوتی ہے؟ تو وہ فوراً ایک گلی میں روپوش ہوگیا۔

خیر، اب ہم اس کی روپوشی سے چشم پوشی کرتے ہوئے اپنی بیگم کی

www.taemeernews.com

طرف آتے ہیں جو ٹی وی پہ "ریلائنس ورلڈ کپ" کا پہلا میچ ملاحظہ فرما رہی تھیں چونکہ وہ زندگی میں پہلی بار ٹی۔ وی پر کرکٹ میچ دیکھ رہی تھیں اس لیے سخت اُلجھن میں مبتلا تھیں۔ اُلجھن اور کنفیوژن پیدا کرنے میں کرکٹ سے زیادہ موثر کھیل ابھی دریافت نہیں ہوا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بابائے کرکٹ کا منشاء بھی یہی رہا ہو۔ ہاں، تو ہم اپنی بیگم کی الجھن کی بات کر رہے تھے۔ ان کی اس اُلجھن کو ری پلے (REPLAY) بھی کافی تقویت پہنچا رہا تھا۔ جب ایک کھلاڑی کو ایل۔ بی۔ ڈبلیو (L.B.W.) آؤٹ قرار دیا گیا تو ہماری بیگم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پوچھ بیٹھیں "یہ وی۔ ایل۔ ڈبلیو (V.L.W.) کیا ہوتا ہے"؟

ہم نے کہا خاموش رہو! وہ وی ایل۔ ڈبلیو نہیں، ایل۔ بی۔ ڈبلیو ہے۔ بچوں نے سن لیا تو ہنسی اُڑائیں گے" (ویسے ہم بھی ایک عرصہ تک ایل۔ بی۔ ڈبلیو کو وی۔ ایل ڈبلیو (ویلیج لیول ورکر۔ VILLAGE LEVEL WORKER) قسم کی ایک پوسٹ ہی سمجھا کرتے تھے۔ اور اس پوسٹ کو حاصل کرنے کے متمنی بھی تھے) ایل۔ بی ڈبلیو کی اپیل پر جب بیٹس مین (BATSMAN) اپنی جگہ سے نہ ہلا تو امپائر نے اپنا سیدھا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیا اور شہادت کی اُنگلی اُٹھائی۔ اس عجیب غریب حرکت پر بیگم سے رہا نہ گیا۔ حیرت سے پوچھا "وہ کیا کر رہا ہے"؟ ہم نے کہا تم بھی تو بوجھو! بڑا آسان سا اشارہ ہے!

بولیں "ہاں سمجھ گئی! وہ شہادت کی انگلی سے اقرار کر رہا ہے کہ اللہ ایک ہے! اُس سے ڈرو!"

وہ اتنا ہی کہہ پائی تھیں کہ بیٹس مین کریز چھوڑ کر سر جھکائے پویلین کی طرف روانہ ہوا۔ اتنے میں ایک فیلڈر جگالی کرتا ہوا نظر آیا۔ ہماری بیگم سے چپ نہ رہا گیا۔ پوچھ بیٹھیں

www.taemeernews.com

، اپنی داڑھ کیوں چلا رہا ہے؟ اور اس کی داڑھ میں کیا ہے؟

ہم نے کہا "وہ چیونگم چبا رہا ہے"۔

فرمائیں "کیا پان کھانے کی اجازت نہیں ہے"؟

عرض کیا کھیلتے وقت پان کھانا کرکٹ کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اور اس میں یہ اندیشہ بھی ہے کہ کھیل میں اگر پلیئروں کے مابین بحث و مباحثہ کی نوبت آجائے تو پان کی پیک کی چھینٹیں پلیئروں اور امپائر پر گریں گی۔ یہ تو صرف شادیوں میں جائز ہے کہ پان بھی کھائیں اور دوسروں پر چھینٹیں بھی اڑائیں!

بیگم نے جنت کی بشارت دیتے ہوئے کہا "اگر کرکٹ کے سارے کھلاڑی مذہبی اصولوں کی اتنی ہی سختی سے پابندی کریں تو بلا روک ٹوک جنت میں جائیں"!

ورلڈ کپ کے مقابلوں کے دنوں میں جب کہ ہمارے خاندان کے سارے افراد کرکٹ فیور میں مبتلا تھے، ہمارے گھر کا اسپین بولر اچانک برین فیور (BRAIN FEVER) میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ برین فیور پر کرکٹ فیور حاوی ہو گیا ہے اور مریض کمنٹری دینے لگا ہے۔ ہم نے تھرمامیٹر دیکھا تو ایک سو تین (۱۰۳) تھا۔ ہمارے منہ سے بے اختیار نکل گیا "افوہ ایک سو تین!"

اس پر برخوردار نے پوچھا "ڈیڈی، اسکور کیا ہے؟"

ہم نے جواب دیا "ایک سو تین!"

بولا "رن ریٹ (RUN RATE) ابھی تک نہیں بڑھا! حیرت ہے!"

ہم نے اس کی بحرانی حالت کو تاڑ کر کہا "چلو بیٹا! ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں!"

وہ بولا "ذرا اس میچ کو تو ختم ہونے دو! پھر اس کے بعد غور کریں گے!"

www.taemeernews.com

جب اس نے لنچ کا مطالبہ کیا تو بیگم نے اس کی خدمت میں ایک سیب پیش کیا۔ سیب چونکہ لال تھا، اس نے اس کو کرکٹ بال سمجھا۔ اور پھر اس نے اس زور سے بالنگ کی کہ سیب ہماری بیگم کی پیشانی کو چاٹتا ہوا "سر پڑ ٹپا" کھاکر ہماری طرف اچھلا تو ہم نے فوراً کیچ لے لیا۔ ہم نے جھٹ دوڑ کر بیگم کے سر پہ ہاتھ پھیرا تو وہاں "پچ" پر ایک گومڑا سا اُبھر آیا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس نے صرف "گگلی" پھینکی تھی۔ اگر فاسٹ بولنگ کی ہوتی تو یقیناً ہماری بیگم کی مڈل اسٹک یعنی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی ہوتی۔ تب بیگم کو پتہ چلا کہ کرکٹ کتنا خطرناک کھیل ہے۔

ورلڈ کپ کے مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے بیرونی ممالک کے جو کھلاڑی آئے تھے ان کے اکثر نام ہماری بیگم کی زبان پہ چڑھتے ہی نہیں تھے۔ یاد رکھنا تو دُور کی بات ہوئی۔ وہ آخر وقت تک آسٹریلیا کی ٹیم کے کپتان ایلن بورڈر کو "لال بارڈر" ہی کہتی رہیں۔

ورلڈ کپ سیمی فائنل کے موقع پہ جب بیگم نے انگلینڈ ٹیم کے لحیم شحیم اور اُونچے قد کے فاسٹ بولر گلیڈ اسٹون اسمال (جن کا نام اصولاً بلیک اسٹون تک ہونا چاہیئے تھا) کو دیکھا تو پوچھا "یہ کون ہے؟ اور کیا کرتا ہے؟"

اس غیر ضروری سوال پہ ہم نے اپنی بیگم کو آج کی نسل یعنی اولاد سے رجوع کیا۔ اس پر منجھلے صاحبزادے نے فرمایا "پلیز ڈیڈی! ممّی کو ہم سے پوچھنے کے لیے کیوں کہہ رہے ہیں؟ وہ بات کو ذرا دیر سے سمجھتی ہیں۔ اور ہم فاسٹ ہیں۔ وہ ہم کو فالو نہیں کر پائیں گی۔ اور پھر یہ تو کرکٹ ہے۔ کبڈی کا کھیل نہیں ہے۔ فیلڈ پوزیشن سمجھانی پڑتی ہے۔ "ہمدرد" کا اینگل سمجھانا پڑتا ہے۔

www.taemeernews.com

ممی کو یہ تمام باتیں سمجھانے سمجھاتے تک اُدھر اوور OVER ختم ہو جائے گا۔ اور ہمارا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا"۔

پھر تو "بیگم" نے اپنا رُخ "زیبا گلشن" کی طرف پھیرا (یعنی ہماری طرف پھیرا) اُس وقت گلیڈ اسٹون اسمال بال کو اپنا تھوک لگا رہے تھے۔ بیگم نے حیرت سے پوچھا "وہ گولے کو تھوک کیوں لگا رہا ہے"؟

ہم نے کہا "وہ تھوک نہیں، بس کر لگا رہا ہے۔ گولے کو پھسلا رہا ہے تاکہ بیٹس مین کو آؤٹ کر سکے"۔

بولیں "کھنکار کے کیوں نہیں تھوکتا"؟

ہم نے کہا "کھنکارنا انگریزی تہذیب کے خلاف ہے۔ انگریز شور و غل کو پسند نہیں کرتے۔ وہ بڑی خاموشی سے اپنا کام کر جاتے ہیں حتیٰ کہ انقلاب بھی لاتے ہیں تو اس کے پیچھے خاموشی کی ڈپلومیسی کام کرتی ہے"۔

اِتنے میں بیگم کا ذہن گلیڈ اسٹون اسمال کے چہرے کی طرف گیا جس کا رنگ ذرا کیا، بہت ہی کالا تھا اور حبشیوں کے زمرے میں آتا تھا۔ بیگم نے فرمایا "اسمال کا رنگ تو دیکھو! پکا جامنی ہے! بالکل حبشی گوڑہ معلوم ہوتا ہے"۔

وہ تو اچھا ہوا کہ ہم ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ اگر ہم مع اپنی اہلیہ فیلڈ پر ہوتے اور اسمال یہ ریمارک سُن لیتے تو وہ اسپورٹس مین اسپرٹ کو بالائے طاق رکھ کر فوراً ایک زور دار باونسر ہماری طرف پھینکتے۔ لیکن گمان غالب ہے کہ ممدوح اسپورٹس مین اسپرٹ سے مغلوب ہو کر فوراً حیدرآبادی انداز میں آداب بجا لاتے۔!

ورلڈ کپ کے اُسی سیمی فائنل کا ذکر ہے کہ ہمارے ملک کے کھلاڑی یکے بعد

www.taemeernews.com

دیکھے آگٹ ہوئے جا رہے تھے۔ اور ہم کفِ افسوس مل رہے تھے۔ جو بھی نیا کھلاڑی میدان میں داخل ہوا۔ ”پچ“ کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اپنی بیاٹ چہرے کے قریب لائی۔ ہونٹ ہلائے۔ بیاٹ پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ کریز پر پہنچنے کے بعد گارڈ لیتے ہوئے گلے میں پہنی ہوئی اپنی زنجیر کا جائزہ لیا۔ زنجیر کے ساتھ کچھ لٹک رہا تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے وہ اپنی تعویذ سے کچھ مشورہ کر رہا ہے۔ ہم اس کی تو ہم پرستی کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ بیگم نے پوچھا ”ابھی ابھی وہ اپنی بیاٹ پر کیا پھونک رہا تھا؟ کیا بیاٹ پر پھونکنا بھی کرکٹ کے قواعد میں داخل ہے؟“

ہم نے سمجھایا ”وہ پھونک نہیں رہا تھا بلکہ بیاٹ پر کچھ دم کر رہا تھا۔ تاکہ دم شدہ بیاٹ سے ”چوکے“ اور ”چھکے“ نکلیں اور فیلڈروں کے چھکے چھوٹ جائیں! جب وہ دوسرے ہی اوور میں کلین بولڈ ہوگیا تو ہماری بیگم نے بولر کو روایتی انداز میں کوسنا شروع کیا:

”خدا گورے کو غارت کرے!“

ہم نے بیگم کو ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ کیوں کہ اب بات کھیل اور تفریح کے جذبے سے نکل کر قومیت اور طرفداری کے حدود میں داخل ہو گئی تھی۔ جب کبھی ایسی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے تو ہم انجان بن جاتے ہیں۔ اور ہمارے اس طرح انجان ہو جانے کو ہمارے دشمن غداری کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

ورلڈ کپ مقابلوں کے دوران ہمارے گھر میں سری لنکا کا ایک کھلاڑی جس کا نام ”ماہنامہ“ تھا، بہت پاپولر ہوا کیوں کہ ہم اردو رسالے اور ماہنامے منگوایا کرتے ہیں۔ جب کمنٹیٹر نے سری لنکا کے کھلاڑی ”ماہنامہ“ کے نام کا اعلان کیا تو بیگم نے جھٹ پوچھا ”یہ کونسا ماہنامہ ہے؟“

ہم نے مسکرا کر جواب دیا ”مزاحیہ ماہنامہ ”شگوفہ“ ـــ!“

www.taemeernews.com

خدا خدا کرکے ورلڈکپ مقابلے اختتام کو پہنچے اور آسٹریلیا کی ٹیم فائنل جیت کر گولڈ کپ اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی کرکٹ فیور جو وبائی شکل اختیار کر گیا تھا قابو میں آ گیا۔ تبھی ہم اپنی بیگم کی فرمائشات پر قابو نہ پا سکے۔ اب تو وہ ماشاء اللہ کرکٹ کی کچھ اصطلاحات غلط موقع پر بولنے بھی لگی ہیں۔ ہماری بیگم اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ انھوں نے کرکٹ کی اصطلاحات پر قابو پا لیا ہے۔ چنانچہ ہم نے ان کا امتحان لینے کے لیے پوچھا "اچھا یہ بتاؤ کہ "فالو آن" کسے کہتے ہیں؟"—

وہ بولیں "یہ تو بہت آسان ہے! آگے بڑھیئے!"

"اچھا تو "گگلی" کے بارے میں کیا خیال ہے"! ہم نے بات آگے بڑھائی۔

"وہ تو ایک دم پگلی ہے، آگے بڑھیئے!"—

ہم نے کہا "آؤٹ!"

بیگم نے جواب دیا "ناٹ آؤٹ!"

www.taemeernews.com

حضرت یُوسُف قوسینؒ

علم ریاضی کی ایک شاخ ہے الجبرا۔ الجبرا میں ایک باب قوسین سے متعلق ہوتا ہے ـــــ چھوٹی قوس۔ منجھلی قوس۔ بڑی قوس۔ ہاں، ایک خط بھی ہوتا ہے جسے ہندسوں کے سروں پر مسلط کیا جاتا ہے۔ اس خط کو ہمارے ریاضی کے استاد "ڈنڈا" کہا کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ریاضی کے گھنٹے میں جب بھی قوسین کا سوال دیا جاتا تو میں سخت اُلجھن میں پڑ جاتا تھا۔ پہلے "ڈنڈا" کو دُور کرو۔ پھر چھوٹی قوس سے نمٹو۔ اس کے بعد منجھلی قوس سے نبرد آزما ہو۔ اور پھر اس کے بعد بڑی قوس سے گزر کر جواب تک جا پہنچو۔ مجھے یہ ترتیب سلسلہ وار کبھی بھی یاد نہیں رہتی تھی۔ اکثر یوں ہوتا کہ پہلے میں بڑی بریکٹ کو دُور کرنے کی حماقت کر بیٹھتا اور نتیجتاً شدید بحران میں مُبتلا ہو جاتا۔ پھر اس کے بعد منجھلی بریکٹ کے منجدھار میں گھر کر غوطے کھانے لگتا۔ جب میں ان غوطوں سے نکل کر چھوٹی بریکٹ کی جانب بڑھنے لگتا تو وہ مجھے اڑنگ پر اونگ لگانے لگتی۔ "ڈنڈا" تو خیر ڈنڈا ہی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے ان قوسوں کے علاوہ الجبرے سے بھی نفرت سی ہو گئی تھی۔ چنانچہ امتحان میں قوسوں والا سوال اگر CHOICE (چوائس) میں ہوتا تو میں ممتحن کو دُعا دیتا ہوا اس سوال کو چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اور اگر "ضروری" ہوتا تو میں دس نمبر کا گھاٹا کر لیتا تھا۔ لیکن یہ گھاٹا مجھے منظور تھا۔

www.taemeernews.com

میں نے الجبرا اور قوسوں والی بات یوں ہی نہیں کہہ دی۔ اس کا سلسلہ تو اُردو کے منفرد مزاح نگار جناب یوسف ناظم سے ملتا ہے۔ آپ یوسف ناظم کے مضامین پڑھیے۔ بے شمار چھوٹی قوسین آپ کو جگہ جگہ اڑنگ لگائیں گی۔ آپ کو یوں معلوم ہوگا کہ مصنف نے پڑھنے کی رفتار کو کم کرنے اور غور و فکر کی دعوت دینے کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ اسپیڈ بریکر لگا دیئے ہیں۔ ویسے یوسف ناظم اگر چاہتے تو بڑی بریکٹ کو بھی ادب میں داخلہ دلوا سکتے تھے۔ ان کے لیے یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ شاید بڑی بریکٹ کا ڈیزائن انھیں پسند نہ آیا ہو۔ یوں بھی بڑی بریکٹ دیکھنے میں بھلی نہیں لگتی اس کو دیکھنے سے یوں لگے گا جیسے چارپائی کو طولاً وعموداً "[ ]" کھڑا کر دیا گیا ہو۔ البتہ یوسف ناظم منجھلی بریکٹ کو بڑی آسانی سے اپنا سکتے تھے۔ وہ دیکھنے میں خوب صورت بھی لگتی ہے اور آرٹ کا ایک اچھا نمونہ { } بھی ہے میں سمجھتا ہوں کہ یوسف ناظم نے اپنے قد کی مناسبت سے چھوٹی قوس کو منجھلی قوس پر ترجیح دی ہے۔

جب میں نے اردو کے مزاح نگاروں کو پڑھنا شروع کیا تو یوسف ناظم کو الجبرا کے قوسین کے سوال کی طرح O/C E ہوم میں چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ ظاہر ہے "الجبرا کے چلے" کو ادب میں بھی قوسین سے سابقہ پڑے تو کیا وہ بدکے گا نہیں؟ لیکن آخر کب تک۔ چنانچہ ایک رات اختر شماری کے بجائے یوسف ناظم کے مضامین میں "قوسین شماری" شروع کر دی۔ مجھے چھوٹی قوس میں جکڑے ہوئے فقرے بھلے لگے اور میں ان کی مزاح نگاری کا قائل ہو گیا۔ آج بھی جب میں ان کا کوئی مضمون پڑھتا ہوں تو سب سے پہلے ان کے مضمون میں پائی جانے والی قوسین کو احتیاطاً گن لیتا ہوں۔ میں ان قوسوں کو یوسف ناظم کا تخلص سمجھتا ہوں۔ وہ بڑی وفاداری سے چھوٹی قوس کا ساتھ نباہتے چلے آ رہے ہیں۔ جس دن یوسف ناظم اپنے کسی

www.taemeernews.com

مضمون ہیں غفلت سے چھوٹی توسین کو تحریر میں لانا بھول جائیں گے اس دن ان کے حریف باتیں ہماری ادبی حلقوں میں یہ بات مشہور کر دیں گے کہ فلاں مضمون جو قوسین سے مُرصّع ہے یوسف ناظم کا ہرگز نہیں ہے بلکہ "مالِ مسروقہ" ہے۔ اگر یوسف ناظم کو یقین نہ آتا ہو اور تھوڑی سی چہل چاہتے ہوں تو بغیر قوسین والا مضمون لکھ کر آزمائش کر لے سکتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج سے چند سال پہلے میں نے ایک خط میں یوسف ناظم کو "حضرت یوسف قوسین" کے القاب سے مخاطب کرنے کی سعادت حاصل کی تھی۔

یوسف ناظم دیکھنے کی چیز نہیں ہیں۔ محکمۂ پولس میں بھرتی کے لیے جو شرائط مقرر کی گئی ہیں ان کا اطلاق یوسف ناظم پر ہرگز نہیں ہوتا۔ وہ صرف نام کے یوسف ہیں۔ پتہ نہیں خوبصورتی کی تقسیم کے وقت کہاں تھے؟ لیکن خدا نے اس کی تلافی یوں کردی کہ سارا حُسن قلم کو عطا کر دیا۔ وہ اپنی باغ و بہار قسم کی تحریروں سے شگفتگی کو تقسیم کرتے چلے آرہے ہیں۔

ادب میں وہ شاعری کے دروازے سے داخل ہوئے لیکن شاعری انھیں راس نہ آئی۔ چونکہ وہ ہوشیار آدمی ہیں اس لیے فوراً اپنی پٹری بدل دی اور طنز و مزاح کی پگڈنڈی پر چل پڑے اور نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی انفرادیت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے اندر جو شاعر چھپا بیٹھا ہے کبھی کبھی سر اُبھارتا ہے تو ان کے ہاں نظموں کی ولادت بھی عمل میں آتی ہے۔ میں نے ان کی سنجیدہ نظمیں (ساری نظمیں سنجیدہ ہوتی ہیں) پڑھ کر ایک قاری اور مدّاح کی حیثیت سے اپنے ایک خط میں توجہ دلانے کی کوشش کی تھی کہ "آپ شاعری کی بجائے اپنی ساری توانائیاں طنز و مزاح پر کیوں نہیں صرف کرتے۔ اس سے طنز و مزاح کا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔"

www.taemeernews.com

جواب میں فرمایا کہ "آپ وہ رسالے ہی کیوں پڑھتے ہیں۔ جن میں میرا کلام چھپتا ہے؟" میں یہ سوچ کر چُپ ہو گیا کہ جس شخص کے اندر، شاعر چُھپا بیٹھا ہو، اس کو سمجھانا اور مشورے دینا "آبیل مجھے مار" کے مصداق ہے۔ چنانچہ میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اگر میں جواباً عرض کرتا تو وہ خطوں کی بارش شروع کر دیتے اور میں ان کے "جواب" دیتے دیتے بالکل قلاش ہو جاتا۔

یوسف ناظم میں بے پناہ تخلیقی صلاحیت ہے۔ میں نے فی البدیہہ شعر موزوں کرنے والے شعراء تو دیکھے ہیں لیکن فی البدیہہ طنز و مزاح لکھنے والے ادیب نہیں دیکھے۔ یوسف ناظم ضرورت یا افتاد آپڑنے پر فی البدیہہ مضمون لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں اور مضمون بھی کیسا؟ ——— شگفتہ اور طنز و مزاح سے بھرپور! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج سے کوئی چھ سات سال پہلے دہلی اردو اکیڈیمی نے طنز و مزاح کا ایک نہایت ہی اعلیٰ اور خوبصورت پروگرام ترتیب دیا تھا جس کے ادبی اجلاس کی صدارت مشہور طنز نگار فکر تونسوی (مرحوم) کو سونپ دی گئی تھی۔ لیکن عین موقع پر فکر تونسوی نے یہ اطلاع دی کہ ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے وہ ادبی اجلاس میں شریک ہونے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ اکیڈیمی کے عہدیداروں نے ادبی اجلاس کی صدارت یوسف ناظم کے سپرد کر دی۔ بہر حال کچھ ہو۔ صدارت کی اُفتاد یوسف ناظم پہ آپڑی تھی اور ہم سب (مزاح نگار) مزے میں تھے۔ میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ وہ صدارت یوسف ناظم کے لیے رحمت تھی یا زحمت یا اُفتاد؟ چاہے کچھ ہو، اُس روز یوسف ناظم کو ڈبل ایکٹنگ نباہنی تھی۔ ادبی اجلاس میں مضمون بھی سُنانا تھا اور خطبہ صدارت بھی پڑھنا تھا۔ جب مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کو ٹیلی فون پر یوسف ناظم تک صدارت کی اطلاع پہنچانے کی خواہش کی گئی تو

www.taemeernews.com

مجتبیٰ نے یوسف ناظم کو صدارت کا مژدہ سناتے ہوئے چھیڑا "لیجئے یوسف ناظم صاحب! نکر تونسوی کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھا کر ادبی اجلاس کی صدارت قبول فرمایئے۔ خُدا کو یہی منظور تھا"

یہاں مجتبیٰ حسین کا ذکر اس لیے آگیا کہ یوسف ناظم ان کے گھر بطور مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ جہاں میں بھی ایک مہمان کی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔ (مجتبیٰ حسین کا ذکر یوں بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ طنز و مزاح کے اکثر و بیشتر پروگراموں کے پیچھے ان کا ہی ہاتھ ہوتا ہے) ہاں تو ادبی اجلاس سے چند گھنٹے پہلے یوسف ناظم خطبۂ صدارت لکھنے کے لیے بیٹھ گئے۔ ادھر مجتبیٰ حسین اپنے تازہ مضمون کو فائنل ٹچ دینے میں مصروف ہو گئے۔ دو مزاح نگاروں میں مقابلے کی زبردست دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ مجتبیٰ حسین لکھنے سے زیادہ کھانسنے لگے تھے (سگریٹ بے تحاشہ پینے کے جو عادی ہیں) اُس دن یوسف ناظم نے بڑا شاندار خطبہ صدارت لکھا اور پڑھا بھی جاندار طریقے سے۔ حالانکہ ان کی آواز بڑی منحنی ہے اور اس پہ طرفہ تماشہ یہ کہ وہ اپنی روانی سے اچھے خاصے جاندار مضمون کو بے جان بنا لیتے ہیں۔ یوں بھی یوسف ناظم کے مضامین سُننے کے نہیں پڑھنے کے ہوتے ہیں ــــ

جہاں تک ان کی مزاح نگاری کا تعلق ہے بڑی سلیس اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ بھاری بھر کم الفاظ اور محاوروں سے اپنی تحریر کو بوجھل نہیں بناتے۔ ان کے نپے تُلے جملوں پر مصرعوں کا گمان ہوتے لگتا ہے۔ ان کے مضامین میں آمد ہی آمد ہے ویسے وہ آورد کو آمد بنانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ وہ اپنے مضامین میں سیدھی چال نہیں چلتے۔ چند سطریں لکھنے کے بعد اچانک اپنا راستہ بدل دیتے ہیں اور پھر راہِ راست پر آجاتے ہیں۔ اس قِسم کی چال کو شطرنج کی اصطلاح میں "ڈھائی گھر چال" کہتے ہیں جو گھوڑے سے

www.taemeernews.com

کے لیے مستعمل ہے اور یہ چال بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ اسپ۔ کشت۔ مات!

میرے دل میں یوسف ناظم کا بڑا احترام ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ اُردو کے بہت بڑے مزاح نگار ہیں، اور دوسرے عمر کی اُس منزل میں ہیں کہ بزرگ کی تعریف میں آتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے آپ کو بزرگ کہلوانا پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ جب بھی ان سے ملاقات ہو جاتی ہے میں ان کا احترام کرنے لگ جاتا ہوں مگر وہ بُرا مان جاتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ سادات کے قائل نظر آتے ہیں۔ ایک مہینہ پہلے کی بات ہے کہ وہ "یادِ ادیب" پروگرام میں حصہ لینے کے لیے حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ وہ ماہنامہ "شگوفہ" کے دفتر پیراں سے ملاقات ہوئی تو میں حسبِ عادت ان کے احترام میں مصروف ہو گیا جب وہ واپس جانے لگے تو میں احتراماً ان کے ساتھ ہو لیا تاکہ سڑک تک چھوڑ آؤں اور ضرورت پڑنے پر آٹو رکشا کا انتظام بھی کروا دوں۔ ابھی وہ دفتر "شگوفہ" سے دس پندرہ قدم دُور چلنے بھی نہ پائے تھے کہ رُک گئے (دفتر شگوفہ بچلرز کوارٹرس کی تیسری منزل پر ہے اور وہاں تک پہنچنے اور وہاں سے نیچے آنے ہر بار بچھتر سیڑھیاں پار کرنی پڑتی ہیں) پوچھا "آپ کہاں جا رہے ہیں"؟ عرض کیا "میں آپ کو چھوڑنے کے لیے آ رہا ہوں"

یہ سنتے ہی فوراً رک گئے۔ فرمایا "آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں۔ میں خود سے چلا جاؤں گا" میں نے نیکی کے موقع کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر دو ایک دلائل پیش کیے۔ اُن دلائل کو حضرت نے پس پشت ڈال کر فرمایا "جب آپ میری نہیں سُنتے تو میں آپ کی کیوں سنوں؟"

مجھے مجبوراً واپس جانا پڑا۔

www.taemeernews.com

یوسف ناظم کوئی نصف صدی سے زائد عرصے سے لکھتے آرہے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا رسالہ ہو جو ان کی تحریر کی زد میں آنے سے بچا ہو ۔ تنقید لکھی۔ اخبار کا کالم لکھا۔ بیسیوں مزاحیہ مضامین لکھے۔ شاعری فرمائی۔ طنز و مزاح کی ایک درجن سے زائد کتابیں شائع کروائیں۔ اتنا سب کچھ لکھنے کے باوجود وہ ابھی تھکے نہیں۔ ان کے ساتھ کے مزاح نگار کب کے گوشہ نشین ہو گئے۔ لیکن یوسف ناظم ہیں کہ "نان اسٹاپ" لکھتے ہی جا رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں سے اردو مزاح کو وقار اور وزن عطا کیا ہے۔ ان کی مزاحیہ تحریروں کو میں ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہوں۔

□□

www.taemeernews.com

کیا باکمال شخص ہے یہ مُصطفٰی کمال!

آج جب کہ ڈاکٹر سیّد مُصطفٰے کمال کی کتاب کی رسم اجراء انجام دی جا رہی ہے تو مَیں دوہری خوشی سے سرشار ہوں۔ پہلی خوشی تو یہ ہے کہ کمال صاحب "صاحبِ کتاب" ہو گئے ہیں۔ مقالے کی پیش کشی کے بعد وہ ڈاکٹر تو تسلیم کر لیے گئے تھے۔ لیکن کتاب کی رسم اجراء کے بعد وہ یہ کہنے کے موقف میں آجائیں گے کہ "مُستند ہے میرا فرمایا ہوا!" حتیٰ کہ اُن کی اُوٹ پٹانگ باتوں اور خواب والی بڑبڑاہٹ کو بھی مُستند مان لیا جائے گا۔ مجھے دوسری خوشی اس بات کی ہے کہ اس سال اُن کی اور میری دوستی کے پچیس سال مکمل ہو گئے ہیں۔ اگر مَیں یہ کہوں تو شاید "صاحبِ کتاب" کو کوئی اعتراض نہ ہو کہ آج کی یہ رسم اجراء کی تقریب ہماری دوستی کی "سلور جوبلی" کی تقریب بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جلسے کے اختتام کے بعد کمال صاحب یہ طعنہ دیں "چھوکٹ کے مال پہ پھپھا کے فاتحہ"۔

کمال صاحب کے ساتھ پچیس سال تک دوستی نبھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے کیوں کہ وہ جسے دوست سمجھتے ہیں اس سے کچھ ایسی توقعات رکھتے ہیں جو ایک بیوی اپنے شوہر سے رکھتی ہے۔ مجھے آج بھی وہ پہلی ملاقات ——— معاف کرنا، ملاقات نہیں پہلا حادثہ اچھی طرح یاد ہے جو اُن کے گھر پر پیش آیا تھا۔ مَیں نے ایک رومانی قسم کا گھٹیا افسانہ لکھ رکھا تھا۔ اور خواہش یہ تھی وہ افسانہ اخبار کے صفحہ پر زیورِ طبع

www.taemeernews.com

سے آراستہ ہو۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے جبکہ کمال صاحب روزنامہ "رہنمائے دکن" کا "شعر و ادب" والا صفو ایڈیٹ (EDIT) کیا کرتے تھے۔ اور ہر ہفتہ نِت نئے انکشافات کے ذریعہ ادب میں ہلچل پیدا کر کے ادیبوں اور شاعروں کو لڑایا کرتے تھے۔ گویا ادب میں جمود کو توڑنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ البتہ اتنی احتیاط ضرور ملحوظ رکھتے کہ فوجداری کی نوبت نہ آنے پائے۔ یہ شعر ان پر پوری طرح صادق آتا تھا: ؎

بڑے مزے سے گزرتی ہے چھیڑ چھاڑ میں عمر
خدا کرے کہ حریفوں کا انتقال نہ ہو

ہاں تو مجھے اس بات کی فکر تھی کہ میرا افسانہ چھپے۔ افسانہ سہی تو کم از کم تصویر ہی چھپ جائے۔ مَیں نے بڑے اہتمام کے ساتھ کوٹ اور ٹائی پر مختلف زاویوں سے دو تین تصویریں کھنچوائی تھیں۔ اب آپ سے چھپانا کیا ہے۔ کوٹ اور ٹائی تو فوٹو اسٹوڈیو کے تھے۔ حتیٰ کہ ڈائرکشن اور پوز بھی فوٹو گرافر کے مرہونِ منّت تھے۔ البتہ داڑھی بالکل اوریجنل تھی۔ میری اپنی۔ مَیں نے افسانہ سے زیادہ تصویر کو مانجھنے میں دلچسپی دکھائی تھی تاکہ افسانے کی اشاعت کے بعد چند حسینوں کے خطوط ملے۔ وہ دَور ہی کچھ ایسا تھا۔ (اور شاید اب بھی ہے) ہمارے بیشتر افسانہ نگار افسانے کو مانجھنے اور چمکانے کے بجائے تصویروں کو مانجھنے اور چمکانے میں خصوصی دلچسپی لیا کرتے تھے..... مختصر یہ کہ میرے ایک دوست مُلّا عنایت اللہ نے یہ عنایت فرمائی کہ کمال صاحب کے گھر پر اُن سے میرا تعارف کروایا۔ اب میں اس وقت کے کمال صاحب کا کیا ذکر کروں؟ اس وقت کے کمال صاحب کا حلیہ بیان کرنے کے لیے آج کے ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال کے تن و توش میں سے ایک تہائی (⅓) حصہ منہا کر لینا پڑے گا۔ آپ چاہیں تو ایک چوتھائی (¼) حصہ بھی منہا کر لے سکتے ہیں حساب اور ناپ تول میں بھول چوک کا امکان رہتا ہے۔

www.taemeernews.com

لیکن احتیاط یہ ملحوظ رہے کہ قد سہانا ہونے پائے۔ تو اُس وقت کے کمال صاحب ملاحظہ احباب میں پیش ہیں :— قد بالکل وہی جو فوج میں بھرتی کے لیے ناموزوں قرار دیا گیا ہے۔ دُبلے پتلے اتنے کہ اگر کوئی زور سے چھینک دے تو لڑکھڑانے لگ جائیں۔ اس پہ طرفہ تماشہ یہ کہ وہ سل کا کُرتا پہنے ہوئے تھے جس کے دو ایک بٹن کھلے تھے۔ جس کی وجہ سے اُن کے دُبلے پن کو چار چاند نہیں آٹھ چاند لگ گئے تھے۔ پاجامے کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ وہ گھر پر کُرتے اور پاجامے میں ہی ملبوس رہتے ہیں۔ ناک پر موٹے موٹے عدسوں والی عینک جسے جھگڑے کے موقع پر اگر کوئی اتفاقاً چھین لے تو موصوف "اندھا بھینسا" کھیلنے لگ جائیں۔ پیشانی کے اُوپر کے بال اس وقت سے ہی "الوداع یا سیّد" کہنے لگے تھے۔ میں نے سوچا کہ جو نوجوان ڈمائن ڈیفیشینسی کا شکار ہو، وہ بھلا "شعر و ادب" کا صفحہ کیا خاک ایڈٹ کرتا ہوگا۔ لیکن تعارف کے بعد جب سوالات کی بوچھار شروع ہوئی تو میں سٹپٹا سا گیا۔

پوچھا "کیا لکھتے ہیں"؟

عرض کیا "افسانہ"!

پوچھا "کیوں لکھتے ہیں"؟

چاہا کہ کہدوں کہ "لکھنا آتا ہے"! لیکن بوکھلاہٹ میں کچھ کا کچھ کہہ گیا۔ میری بوکھلاہٹ سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے پھر پوچھا "افسانے میں ہوتا کیا ہے"؟

میں نے منمناتے ہوئے جواب دیا "یہی ایک تکون ہوتا ہے۔ ہیرو، ہیروئن اور ویلن"! طنزیہ مسکراہٹ سے فرمایا "میں اس قسم کے افسانے نہیں چھاپتا! " اور پھر مُفت میں مشورہ بھی عنایت فرمایا کہ "مزاح لکھیے۔ طنز لکھیے۔ اس کی ہمارے سماج کو سخت ضرورت ہے۔ میں طنز و مزاح کو دیگر اصناف پر ترجیح دیتا ہوں!"

www.taemeernews.com

اب وہ اس قسم کے مشورے کچھ کھائے پیئے بغیر نہیں دیتے (اشارہ بریانی چائے اور سگریٹ کی طرف ہے)۔ اس حادثے کے بعد میں بہت کچھ سنبھل گیا تھا۔ لیکن کمال صاحب سے جب ملاقاتیں بڑھیں تو پتہ چلا کہ وہ انتہائی مخلص انسان ہیں۔ اور طنزیہ جملے چھوڑنا اور مزاح سے لطف اندوز ہونا اُن کی عادت ہے۔ ان سے گھر پر ملئے تو وہی لطف آئے گا جو ایک خوبصورت انشائیہ پڑھنے سے آتا ہے۔ اس طرح کمال صاحب نے مجھے افسانے کے جنگل سے نکال کر طنز و مزاح کی ہموار دار پگڈنڈی پر ڈال دیا۔ یہی نہیں، کچھ عرصہ بعد یہ عنایت بھی فرمائی کہ اس خاکسار کو "شگوفہ" کی مجلس ادارت میں شامل کر کے ارادت مندوں میں ایک کا اضافہ کرلیا۔ البتہ سالنامہ ۱۹۹۱ء کی اشاعت سے قبل انہوں نے بڑے اصرار کے ساتھ چائے پلائی اور "یوم نجات" منایا۔

کمال صاحب کے ظاہر کو مت دیکھیے۔ وہ جتنا باہر ہیں، اس سے دُگنا اور تین گنا اندر بھی ہیں۔ اُن کا سینہ رازوں اور یادوں کا ایک دفینہ ہے۔ یادوں پر تو انھوں نے پردہ ڈال دیا ہے۔ ان کی یادوں سے ہمیں کیا لینا دینا۔ البتہ رازوں سے بہت سوں کا بھلا ہو سکتا ہے۔ یہ ان کی خارجہ پالیسی ہے یا داخلہ پالیسی، شگوفہ پالیسی ہے یا تجارتی پالیسی کہ وہ اپنا راز کسی کو نہیں بتاتے۔ اور اُن رازوں کو اگلوانے کے لیے انہیں ہپناٹائز کرنا پڑے گا۔ راز کے سلسلے میں مجھے تنالی رام لنگم یاد آگئے۔ تلگو والوں میں تنالی رام لنگم نامی ایک شخص گزرا ہے جس کے پیٹ میں کوئی بات چھپتی نہیں تھی۔ تلگو میں تنالی رام لنگم کی وہی حیثیت ہے جو تاریخ میں بیربل کی ہے۔ ایک دن بادشاہ نے تنالی رام لنگم سے ایک راز کی بات کہہ دی اور ساتھ ہی اس کو جتا دیا کہ راز اگر باہر گیا تو اُس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ اب وہ بات رام لنگم کے پیٹ میں مچلنے لگی۔ وہ بولتا تو کس سے۔ بالآخر

www.taemeernews.com

عافیت سے مجبور ہوکر رام لنگم نے جنگل کی راہ لی اور ایک سنسان علاقے میں ہڈی احتیاطاً کیے تھے سارا راز ایک چوہے کی بِل میں اُگل دیا۔ اِس حکایت کو سُنانے کا مقصد یہ ہے کہ اگر رام لنگم کی جگہ مُصطفٰے کمال ہوتے تو بادشاہ کا ہی سر قلم کر دیتے کہ اس نے راز کو راز ہی کیوں نہ رہنے دیا، آشکارا کیوں کیا!؟

اگر کسی شاعر یا ادیب کو کتابت، طباعت اور وغیرہ وغیرہ کے سلسلے میں زریں مشورے لینا ہوں تو کمال صاحب سے زیادہ موزوں شخصیت اس شہر میں کوئی نہیں ہے خیال چہ ان سے مشورے لینے کے لیے مختلف حضرات دفترِ "شگوفہ" پر آتے ہی رہتے ہیں جن میں ان کی کچھ سہیلیاں اور پردہ دار خواتین بھی ہوتی ہیں۔ حضرات قسم کے لوگوں سے وہ جس طرح پیش آتے ہیں وہ لے دے کی تعریف میں آتا ہے۔ لین دین کی تعریف میں نہیں۔ البتہ خواتین کو مشورے دیتے وقت وہ اچانک مولانا حالیؔ بن جاتے ہیں۔ اور پھر فرماتے ہیں ـــــ "اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! ملک کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے"! میری خوش خطی کو دیکھ کر کئی بار موصوف نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ میں کتابت کرنا سیکھ جاؤں اور "شگوفہ" کی کتابت کا کام سنبھال لوں۔ اس زرّیں مشورے پر وہ خود اس لیے عمل نہیں کرتے کہ اُن کی ہینڈ رائٹنگ کیڑے مکوڑوں کی تعریف میں آتی ہے۔ کسی زمانے میں امتحانی پرچوں پر پانچ نمبر خوش خطی کے جو محفوظ کیے جاتے تھے شاید موصوف کی ہینڈ رائٹنگ ہی کا نتیجہ ہو۔ ان کو ایم۔اے میں گولڈ میڈل ملا ہے خراب ہینڈ رائٹنگ کا بھی اُن کو ایک گولڈ میڈل دیا جانا چاہیے تھا تاکہ "ڈبل گولڈ میڈلسٹ" کہلائیں۔

کمال صاحب نے ہر کام ٹھیک وقت پر کیا ہے، سوائے شادی کے۔ اس میں ان کی کاہلی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ البتہ انہوں نے اس کی تلافی یوں کر دی کہ

www.taemeernews.com

عقد کے روز ایک سکنڈ بھی ضائع نہیں کیا۔ ٹھیک وقت پر نوشہ بنے اور ٹھیک وقت پر مسند پر آ بیٹھے۔ انھوں نے شادی وقت پر نہیں کی تو کیا ہوا؟ شادی کے بعد کے تمام کام وقت پر انجام دیئے جا رہے ہیں۔

موصوف کو ٹھیلوں اور بنڈلوں پر تلی جانے والی مرچیاں کھانے کا بڑا شوق ہے۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی موضوع پر بحث کرتے کرتے حجت کی منزل پر پہنچ جاتے ہیں تو مخاطب کو مرچیاں سی لگ جاتی ہیں۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ مرچیاں کھانے کا شوق وہ سڑک پر کھڑے کھڑے ...... نہیں فرماتے۔ اردو کے لیکچرار جو ٹھہرے۔ شاید انہیں یہ دھڑکا لگا رہتا ہو کہ کہیں کوئی شاگردِ رشید نمودار ہو کر "آداب صاحب" نہ کہہ دے۔ شاگردوں کا اتنا پاس و لحاظ رکھنے والے لیکچرار اب خال خال ہیں۔

کمال صاحب جب کسی سے ناراض ہو جاتے ہیں یا کوئی ان سے تکرار کر بیٹھتا ہے تو وہ اپنا سارا غصہ اپنی اسکوٹر پر نکالتے ہیں۔ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ ویسے وہ نارمل حالت میں بھی اسکوٹر کی رفتار کو نارمل کب رکھتے ہیں۔ اسکوٹر پر بیٹھتے ہی ان کو حال سا آنے لگتا ہے۔ وہ اس وقت یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کا کیا حال ہے، وہ ہے بھی یا گزر گیا۔ تین چار تجربوں کے بعد تو افسانہ نگار رعاتی شاہ نے ان کی اسکوٹر پر پیچھے بیٹھنا چھوڑ دیا ہے بلکہ باضابطہ توبہ بھی کر لی ہے۔ اب اگر مصطفیٰ کمال کبھی انہیں لفٹ دینا بھی چاہیں تو وہ یہی فرمائیں گے کہ بھئی مجھے کیوں بٹھاتے ہو؟ مجھے تو اور کئی سال زندہ رہنا ہے اور کئی افسانوں کے مجموعے شائع کرانا ہے۔ اگر بٹھانا ہی ہے تو مسیح انجم کو بٹھاؤ۔ وہ بے کار آدمی ہے۔"

سیکل سے لے کر سیکنڈ ہینڈ اسکوٹر تک اور "چیتک" سے لے کر "ایل ایم پی"

www.taemeernews.com

دیسیا تک میں مصطفیٰ کمال کا ساتھی رہا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں نے کمال صاحب کو پہچانا ہی نہیں۔ ان کی ذات کے اطراف کئی حصار ہیں۔ ان کے دوستوں میں کوئی "ایک حصاری" ہے تو کوئی "دو حصاری" کوئی "تین حصاری" لیکن "یا الا حصاری" کوئی نہیں ہے۔

"شگوفہ" اور "دفترِ شگوفہ" کمال صاحب کی شخصیت کا ایک حصہ ہیں۔ ان دونوں کے بغیر ان کی شخصیت اس مکان کی سی ہو جائے گی جس کا سائبان نہ ہو۔ ابتداء میں "شگوفہ" کا آفس "مجرد گاہ" پر "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے کمرے میں تھا۔ وہاں سے کمال صاحب نے اس کو مجرد گاہ کی تیسری منزل (جو آخری منزل بھی ہے) کے کمرہ نمبر (۳۱) میں منتقل کیا۔ ہمارے بزرگ مزاح نگار جناب رشید قریشی پہلی بار کمرہ نمبر ۳۱ پر تشریف لائے تو کمال صاحب نے پوچھا "کیوں رشید بھائی شگوفہ کا آفس کیسا ہے؟" رشید صاحب جو مجرد گاہ کی (۷۵) سیڑھیاں چڑھ کر آئے تھے، ہانپتے ہوئے بولے "میاں! آفس تو اچھا ہے۔ لیکن یہ اتنی اونچائی پر ہے کہ یہاں آنے کے بعد عاقبت یاد آجاتی ہے۔ یہ دفترِ شگوفہ نہیں، دفترِ عاقبت ہے!!!" شگوفہ اور دفترِ شگوفہ کو سنوارنے میں کمال صاحب نے اتنی زیادہ دلچسپی لی کہ وہ خود نہ سنور سکے۔ سنبھلنے کیا خاک؟ دفترِ شگوفہ کسی اردو رسالے کے ایڈیٹر کا آفس ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اگر کسی انکم ٹیکس آفیسر کی اس پر نظرِ بد پڑ جائے تو شاید انکوائری شروع کر دے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس وقت مصطفیٰ کمال کو ضرور کوئی نہ کوئی شرارت سوجھے گی۔ ان کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھے گی۔ وہ ضرور اس انکم ٹیکس آفیسر کے سامنے بائیس سال سے رکھا ہوا ناقابلِ اشاعت کلام اور ناقابلِ اشاعت مضامین کا ڈھیر ردی کے طور پر پیش کر کے یہ فرمائیں گے:

www.taemeernews.com

"گر قبول افتد زہے عزّ و شرف!"

ڈاکٹر مُصطفےٰ کمال نے اپنے مقالے "حیدرآباد میں اردو کی ترقی" کو اپنی چار بیٹیوں اسنیٰ، افرح، سہا اور نیساں کے نام معنون کیا ہے۔ اس معاملے میں مجھے ان سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ لڑکیوں کی اس فہرست میں "شگوفہ" کو بھی شامل کر دیتے تو ان سے کوئی جواب طلب نہ کرتا۔ مَیں تو "شگوفہ" کو کمال صاحب کی اولادِ نرینہ سمجھتا ہوں۔ میرے اس خیال پہ زندہ دلان کے صدر جناب نریندر لوتھر شاید یہ اعتراض کریں کہ "شگوفہ" تو "زندہ دلانِ حیدرآباد" کی اولاد ہے" تو مَیں ان سے بہ ادباً عرض کروں گا کہ کمال صاحب نے اس کو متبنیٰ لیا ہے!"

خواہ اولاد کسی کی ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آج کل بچے پیدا کرنا تو بہت آسان ہے۔ "ٹسٹ ٹیوب بے بی" والے طریقے نے تو کئی بانجھ جوڑوں کو صاحب اولاد بنا دیا ہے۔ اصل مسئلہ تو اولاد کی پرورش ہے۔ ہندوستان میں اردو کے کئی رسالے تو دم توڑ چکے ہیں اور جو گنتی کے چند ہیں نزع کے عالم میں ہیں۔ کمال صاحب نے "شگوفہ" کو ایک بیٹے کی طرح پالا پوسا اور جوان کیا اور اب تو وہ برصغیر کے تمام رسالوں سے نہ صرف آنکھ مِلانے لگا ہے بلکہ آنکھ بھی مارنے لگا ہے۔

میرا یہ کام نہیں کہ ادب میں مزاح کے مقام کا تعین کروں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ "شگوفہ" کی وجہ سے "طنز و مزاح" کو ادب میں ایک مقام ملا۔ لیکن مُصطفےٰ کمال کو کچھ نہیں ملا سوائے آہ، واہ کے۔ اس کے باوجود وہ "شگوفہ" کے نمبر پر نمبر شائع کرتے جا رہے ہیں اور اب تو وہ "نمبری" کہلانے لگے ہیں۔ پاکستان میں ماہ نامہ "نقوش" کے ایڈیٹر محمد طفیل صاحب کو "خاص نمبر" شائع کرنے کا اعزاز حاصل تھا۔ لیکن ادھر ہندوستان میں یہ اعزاز مُصطفےٰ کمال کو حاصل ہے اسی لیے

www.taemeernews.com

مَیں کمال صاحب کو محمد طفیل کے نام کی مناسبت سے "مُصطفیٰ طفیل" کہتا ہوں۔

یہ سچ ہے کہ کمال صاحب ہر کام کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کرتے ہیں لیکن وہ کسی کام کو اپنے ہاتھ میں لیتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ پہلے ہی سے کچھ فرمائشی، فہمائشی اور سفارشی کام پینڈنگ میں پڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جب وہ ان تمام "فالتو ۔ پالتو" کاموں میں گھر کر آزمائش سے گزرتے ہیں تو دفتر شگوفہ پر ایک سماں سا بندھ جاتا ہے اگر آپ بیک وقت کئی کام کرتے ہوئے کسی شخص کو دیکھنا چاہتے ہوں تو آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں شگوفہ کے کسی خاص نمبر یا سوونیر کی تیاری کے دِنوں میں آپ سیدھے "شگوفہ" کے دفتر کو سرِشام چلے جائیے۔ آپ کی تفریح بھی ہو جائے گی اور چائے بھی ملے گی۔ اس وقت آپ کمال صاحب کی اسٹیڈی کرنے کے لیے چپ چاپ کہیں بیٹھ جائیے۔ لیکن یہ پتہ نہ چلے کہ آپ ان کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اچانک وہ نیم دراز ہو جائیں گے۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں گے لیکن وہ اپنے ذہن میں کام کی اسکیم بنا رہے ہوں گے۔ اچانک وہ اپنی آنکھیں کھول دیں گے۔ جھٹ کرسی سے اٹھ کر سیدھے باتھ روم جائیں گے۔ وہاں فرد حاجت سے فارغ ہو رہے ہوں گے کہ ادھر فون کی گھنٹی بج اُٹھے گی۔ اندر ہی سے "ہیلو"! بولیں گے اور پھر تیز تیز قدموں سے باہر آ کر چہرے کا پانی انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے فون کا ریسور اٹھائیں گے۔ پھر "ہیلو" بولیں گے "ہیلو" اور گفتگو میں اتنی احتیاط برتیں گے کہ وہ نشر نہ ہونے پائے اور وہاں بیٹھے ہوئے احباب معاملے کی تہہ کو نہ پہنچ سکیں۔ بات کرتے جائیں گے اور پیشانی اور آنکھوں کو سہلاتے بھی رہیں گے۔ اتنے میں انھیں عینک یاد آ جائے گی۔ عینک کی بجائے پیپر ویٹ اٹھا لیں گے۔ غلطی کا احساس ہونے پر پیپر ویٹ رکھ دیں گے اور عینک اٹھا لیں گے۔

www.taemeernews.com

پھر انھیں الماری یاد آجائے گی۔ جھٹ الماری کی طرف لپکیں گے۔ لیکن ہاتھ میں الماری کی کنجی کے بجائے ٹیلی فون کی کنجی معہ قفل ہوگی۔ ٹیلی فون کو لاک کرکے الماری کی کنجی لیں گے۔ الماری کھول کر کتابت شدہ کاغذات نکالنا چاہیں گے تو ان کی نظر تولیہ پر پڑے گی۔ تب انھیں یاد آئے گا کہ "ارے میں نے تو ابھی اپنا چہرہ پونچھا بھی نہیں!" پھر تو وہ ایک ہاتھ سے تولیہ نکالیں گے تو دوسرے ہاتھ سے کتابت شدہ کاغذات ایک ہاتھ سے چہرہ صاف کرتے جائیں گے تو دوسرے ہاتھ سے کاغذات میز پر رکھیں گے۔ چوں کہ اب ایک ہاتھ کو فرصت ملی ہے، اس سے کنگھا نکالیں گے اور پھر اسی ہاتھ سے اپنے مختصر اور مفید بالوں میں جھٹ جھٹ دو تین بار کنگھا پھیریں گے۔ کنگھا جیب میں رکھیں گے اور تولیہ کاتب کو دیں گے۔ کاتب سوچے گا کہ "یہ کیا بوالعجبی ہے" ــــــ اب میں ان حرکتوں کو کہاں تک گناؤں؟ ایک منفرد اور مشاق مائم آرٹسٹ ہی ان تمام حرکتوں کو دل کش انداز میں پیش کرسکتا ہے میری مجبوری یہ ہے کہ میں کوئی مائم آرٹسٹ نہیں ہوں اگر میں ایک مائم آرٹسٹ ہوتا تو کمال صاحب کی خاطر اسٹیج پر وہ بھی پیش کرتا۔ جسے "مائم آرٹ" کہتے ہیں۔ دوستی میں اتنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر کمال صاحب "نمائش" کے دنوں میں یہی کام ایک "اسٹال" کھول کر انجام دیں تو اچھی خاصی آمدنی ہوگی۔ کیا عجب کہ "گنیز بک" میں نام بھی شامل ہو جائے۔

(یہ خاکہ کمال صاحب کی کتاب "حیدرآباد میں اردو کی ترقی ـــ سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے" کی رسم اجراء کے موقع پر پڑھا گیا)

■■

www.taemeernews.com

فیلڈ مارشل عاتق شاہ

"السلام علیکم!"

- - - - - - - -

"خیریت!"

- - - - - - - -

یہ سلامتی اور خیریت کے کلمات میرے نہیں، افسانہ نگار عاتق شاہ صاحب کے ہیں۔ دوست احباب کسی ہوٹل کے قریب یا کسی فٹ پاتھ کے کنارے کھڑے ہوئے بات چیت میں مصروف ہوں، اور ایسے میں عاتق شاہ گھومتے گھامتے کہیں سے آدھمکیں تو اُن کے منہ سے پہلے پہل یہی کلمات نکلتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر کوئی قسمت کا مارا بننا شروع کر دے یا ڈینگیں مارنے لگے تو پھر عاتق شاہ سے چپ نہیں رہا جاتا۔ ان کی خود ساختہ فوجی رگ بے ساختہ پھڑک اٹھتی ہے اُس وقت اُس شخص کی خیریت اسی میں رہتی ہے کہ وہ "دبکی نامہ" لکھ دے۔ یا پھر خندہ پیشانی سے اپنی پسپائی تسلیم کر لے۔ ایسے سچویشن پر میں نے بعض خود ساختہ دانشوروں کو "ضرورت" کا بہانہ بنا کر موقع واردات سے کھسکتے دیکھا ہے۔ اس کے برعکس اگر موقع واردات پر موجود سبھی لوگ نارمل قسم کے انسان ہوں تو پھر عاتق شاہ، بقول اُنھیں کے "حریر و پرنیاں" بن جاتے ہیں۔ "حریر و پرنیاں" والی اصطلاح عاتق شاہ نے گڑھی ہے یا کہیں سے لی ہے، یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں

www.taemeernews.com

نے یہ محاورہ سوائے عاتق شاہ کے کسی اور کے منہ سے نہیں سُنا۔ اور جب بھی سُنا خوب لُطف اندوز ہوا۔ مگر عاتق شاہ سے اُن کے معنی پوچھنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی۔ ہر بار یہی سوچ کر خاموش رہا کہ "حریرہ دپرنیاں" کے معنی پوچھ کر "حریرہ" کیوں بنوں۔؟

اب ٹھیک سے یاد نہیں پتہ کہ وہ مُبارک دن اور نیک ساعت کونسی تھی جب عاتق شاہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ البتہ اِتنا ضرور یاد ہے کہ ان سے دوستی کے بعد دوست احباب میری خیر خیریت بہت زیادہ ہی دریافت کرنے لگے تھے۔ اُس وقت مجھے یوں لگا تھا جیسے میں عاتق شاہ سے قریب نہیں ہو رہا ہوں بلکہ ایک قدیم اور پُراسرار عمارت میں داخل ہونے کی حماقت کر رہا ہوں۔ ایک دوست کو تو اس حد تک تشویش لاحق ہوگئی تھی کہ ایک روز سڑک پر اس نے مجھے پکڑ ہی لیا۔
کہو کیا حال ہے؟ عاتق شاہ سے کیسی نبھ رہی ہے؟"
میں نے جواب دیا "سب ٹھیک ٹھاک ہے ابھی ابھی عاتق شاہ صاحب کے گھر سے کھانا کھا کر لوٹ رہا ہوں"
اُس نے اچنبھے کا اظہار کیا "خیریت ہے؟ تم نے کھانا کھایا ہے! میں تو "ڈشم ڈشم" کی توقع کر رہا تھا!"

ہاں تو میں عاتق شاہ سے اپنی ابتدائی ملاقاتوں کا ذکر کر رہا تھا۔ جوں جوں عاتق شاہ سے دوستی بڑھتی گئی، ویسے ویسے مجھ پر یہ راز کھلتا گیا کہ اپوزیشن والوں نے شاہ صاحب کے بارے میں جو افواہیں پھیلا رکھی ہیں وہ ساری کی ساری غلط فہمیوں کا نتیجہ ہیں۔ ویسے اس میں تھوڑا سا قصور عاتق شاہ کے کھرے مزاج اور کھردرے لہجے کا بھی ہے۔

www.taemeernews.com

ع
کچھ تو ہوتے ہیں محبّت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

عاتق شاہ سے میری دوستی کوئی دس سال پرانی ہوگی۔ دس سال پہلے اُن کی عمر جہاں ٹھہری ہوئی تھی، آج بھی وہیں ٹھہری ہوئی ہے۔ ان کی عمر ایک معمہ ہے، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

حال حال تک عاتق شاہ کلین شیو رہنے کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ لیکن اب انھوں نے موچھوں کو پنپنے کا موقع عطا کیا ہے۔ اور موچھیں بھی کیسی؟ — لمبی اور گھنی! جب عاتق شاہ چائے پیتے ہیں تو ان کی موچھیں بھی چائے نوشی میں شریک ہوجاتی ہیں۔ (کبھی کبھار شریکِ طعام بھی ہوجاتی ہوں گی) دراصل یہ اُن کی "موچھ نوازی" نہیں" ذرہ نوازی" ہے۔ اگر داڑھی کو پنپنے کا موقع عطا کرتے تو یقیناً مولانا عاتق شاہ کہلاتے۔ (یہ موقع ابھی ہاتھ سے نہیں گیا) اس حقیر و فقیر نے اِس جانب عاتق شاہ کو توجہ بھی دلائی۔ اور سند کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حالؔی کا حوالہ بھی دیا۔ سُن کر آگ بگولہ ہوگئے۔ اس بندۂ پُر تقصیر نے فوراً معذرت چاہی۔ اور عرض کیا۔

ع خطا دار ہوں میں، جزا چاہتا ہوں

مصرعہ سُن کر فوراً ہوٹل لے گئے۔ چائے پلائی۔ اور سزا تجویز کی کہ "بل" میں ادا کردوں۔ تب فرمایا:

" آج کل داڑھی والے بدنام ہیں۔ میں یہ بدنامی مول لینا نہیں چاہتا"۔

یہ سُن کر بے اختیار میرا ہاتھ اپنی داڑھی کی طرف چلا گیا۔ لیکن اس حرکت کا ان پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔

www.taemeernews.com

ان دنوں عاتق شاہ مونچھوں کی وجہ سے "فیلڈ مارشل" قسم کی ڈراؤنی مخلوق نظر آنے لگے ہیں۔ اُنھوں نے جس دن سے اپنی مونچھیں بڑھائی ہیں، شہر میں اُن کی مونچھیں موضوعِ سخن بنی ہوئی ہیں۔ چونکہ میں عاتق شاہ کا قریبی دوست ہوں اس لیے اُن کے بہت سے ساتھی مجھے پکڑ پکڑ کر اُن کی مونچھوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ جیسے وہ مونچھ نہ ہوں، عاتق شاہ کے بال بچے ہوں۔ خیریت تو بیوی اور بال بچوں کی پوچھی جاتی ہے۔ مونچھوں کی نہیں۔ معقول لوگوں کی ایسی ہی نامعقول باتوں پر عاتق شاہ بھڑک اُٹھتے ہیں۔

کسی زمانے میں عاتق شاہ صرف ایک عینک لگاتے تھے۔ اب وہ اپنے ساتھ دو عینکیں رکھنے لگے ہیں۔ ایک گھر سے نکلتے وقت لگانے کے لیے۔ اور دوسری لکھنے پڑھنے کے لیے۔ خدا وہ دن نہ لائے جب دو عینکوں کو ڈھونڈھنے کے لیے عاتق شاہ کو تیسری عینک کی ضرورت پڑے۔

عاتق شاہ کے داڑھی نہ رکھنے کے عمل سے آپ اس غلط فہمی میں مُبتلا نہ ہوں کہ عاتق شاہ صرف اعداد شماری کے مسلمان ہیں۔ بھلے ہی وہ نماز نہ پڑھیں لیکن عقیدے کے وہ بڑے پکے ہیں۔ کوئی اُلجھن آپڑے تو یہی کہیں گے کہ اللہ بہت بڑا ہے۔ کوئی بگڑا کام بن جائے تو کہیں گے کہ کملی والے کا صدقہ ہے۔ اس سے آگے اُن سے یہ مت پوچھیے کہ دُعائے قنوت کب پڑھی جاتی ہے؟ اور سجدۂ سہو کب لازم ہوتا ہے؟

عاتق شاہ کسی زمانے میں کثرت سے سگریٹ پیا کرتے تھے۔ لیکن ہارٹ اٹیک کے بعد ڈاکٹروں نے ان کی سگریٹ نوشی پر پابندی لگادی ہے۔ چنانچہ عاتق شاہ نے ضد میں زردے کا پان کھانا شروع کیا ہے۔ اور زردہ بھی کونسا؟

www.taemeernews.com

راج رتن چھینٹا ! میں نے پان کی گنتی تو نہیں کی ہے۔ البتہ میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک کام چور نوکر دن بھر میں اپنے مالک کی جتنی گالیاں کھاتا ہے عاتق شاہ دن بھر میں اتنے ہی پان کھاتے ہیں۔

پیسوں کے معاملے میں عاتق شاہ بڑے محتاط رویہ کے حامل ہیں فضول خرچی کے وہ قائل نہیں اور نہ وہ دوسروں کو اس کی اجازت دیتے ہیں۔" عاتق شاہی اسکیم" کے تحت اپنی کتاب کی اڈوانس بکنگ کروائی ہوئی رقم کو وہ ایک ایسے "چور جیب" میں رکھتے ہیں جس کا تصور اگر پاکٹ پلیئرس کریں تو ان کے تصور کے پر جل جائیں ___ میں یہاں ریزگاری کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میری مراد نوٹوں سے ہے۔ نوٹوں کو نکالنے کے لیے وہ سب سے پہلے اپنے پینٹ کا بلٹ کھولیں گے۔ پھر پتلون کو ذرا ڈھیلا کریں گے۔ اس کے بعد بنیاں کے نچلے حصّہ کو اوپر کھینچیں گے۔ تب آپ کو بنیان کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا "چور جیب" سیا ہوا نظر آئے گا۔ اس کے اندر سے ایک پلاسٹک کور برآمد کریں گے۔ اس کور کے اندر کاغذ میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا پرس ہوگا۔ اس پرس کے اندر مزید کچھ کاغذات ہوں گے۔ اور اُن کاغذات کے اندر بڑے سلیقے سے تہہ کئے ہوئے نوٹ ہوں گے۔ یہ ہے عاتق شاہ کا "لاکر" (LOCKER)۔ ہے کوئی بینک جو اس قسم کا جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا لاکر LOCKER مہیا کرے!۔

عاتق شاہ کی ذات سے کسی انڈسٹری کو فائدہ پہنچا ہو یا نہ ہو، مگر فلم انڈسٹری کو زبردست فائدہ پہنچا ہے۔ وہ فلموں کے بڑے دلدادہ ہیں۔ شاید ہی کوئی فلم ان سے چھوٹتی ہو۔ میں اگر ساتھ رہوں تو عاتق شاہ جنتا کلاس کو عزت بخشتے ہیں۔ اور اگر ڈاکٹر مصطفےٰ کمال ساتھ ہوں تو رائل کلاس منتخب کرتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر

www.taemeernews.com

حیران رہ جاتا ہوں کہ ایک سرکش اور کنگ سائز افسانہ نگار، ایک میڈیم سائز ڈاکٹر کے قابو میں کیوں اور کس طرح آگیا؟ شاید کمال صاحب نے عاتق شاہ کو کچھ گھوٹ کر پلایا ہو۔

جب فلموں کی بات چل نکلی ہے تو میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ عاتق شاہ اُس ٹاکیز میں جانا پسند کریں گے جو اُن کی ناک کی سیدھ میں واقع ہو۔ اگر ٹاکیز سڑک کے دوسرے کنارے ہو اور عاتق شاہ کو سڑک پار کرنی ہو تو ان کے سڑک پار کرنے کرنے ایک شو SHOW بدل جاتا ہے۔ اور اگر سکنڈ شو ہو تو تاریخ بدل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ عرض کرنا یہ ہے کہ سڑک پار کرنا، عاتق شاہ کے بس کی بات نہیں۔ اس وقت عاتق شاہ کی ساری "فیلڈ مارشلی" دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اور وہ بالکل ایک برخوردار اور اطاعت گزار قسم کی مخلوق بن کر رہ جاتے ہیں۔

تھیٹر میں داخل ہونے کے بعد وہ پھر سے فیلڈ مارشل بن جاتے ہیں۔ اور پھر مونگ پھلی کھاتے ہوئے مختلف ریمارکس پاس کرنے لگتے ہیں۔ فلم اگر جاندار ہو تو ہر اچھے سین کے ساتھ ساتھ ٹکٹ کے پیسوں کی فرضی واپسی کا اعلان شروع کر دیتے ہیں۔ اس اعلان پر ہراج خانہ کی بولی کا گمان ہوتا ہے:

"واہ! چار آنے واپس کیا!"

"اب تو آٹھ آنے واپس ہوئے"!

"ڈیڑھ روپیہ واپس کیا، ابھی ڈیڑھ روپیہ باقی ہے"!

"تین روپے واپس ہو گئے"!

"ٹکٹ کے پورے پیسے واپس ہو گئے۔"!

www.taemeernews.com

ایک بار میرے بازو بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے رہا نہ گیا۔ وہ مجھ سے پوچھ بیٹھے:

بھائی صاحب! وہ کون ہے جو اُن کے پیسے واپس کرتا جا رہا ہے؟ مگر ہمارے پیسے واپس نہیں کرتا؟

تو یہ ہیں عاتق شاہ کے فلم دیکھنے کے انداز۔ اور یہی ان کی واحد تفریح ہے جہاں وہ کچھ دیر کے لیے فلمی نقاد بن جاتے ہیں۔ فلم سنسر بورڈ کی رکنیت کے لیے عاتق شاہ سے زیادہ موزوں شخصیت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

لکھتے وقت ہر ادیب کی نشست و برخواست کا ایک خاص انداز ہوتا ہے انگریزی کے ایک ادیب کے بارے میں میں نے پڑھا ہے کہ وہ لکھتے وقت سڑے ہوئے سیب سونگھا کرتا تھا۔ اُسے سڑے ہوئے سیب کی بو، بڑی مرغوب تھی۔ لیکن جب عاتق شاہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو اگربتی جلا کر اطراف کی فضا کو معطر کر دیتے ہیں۔ پہلی بار جب میں نے اُنھیں اگربتی کو جلاتے اور فضا کو معطر کرتے دیکھا تو یہ سمجھا کہ وہ فاتحہ پڑھنے والے ہیں اور فاتحہ ختم کرتے ہی تبرک پیش کریں گے۔ یہ میری خوش فہمی تھی۔ عاتق شاہ تخلیقی عمل کو ایک نیک اور خوشگوار فریضہ کے طور پر انجام دیتے ہیں۔

عاتق شاہ کوئی چالیس برس سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں۔ اُن کے ساتھ جو ترقی پسند شاعر اور ادیب اُبھرے تھے ان میں سے چند تو اللہ کو پیارے ہو گئے اور چند ابھی ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔ اور چند راہِ راست پر آ کر اللہ اللہ کر رہے ہیں۔ لیکن عاتق شاہ ہیں کہ فلمیں دیکھ رہے ہیں افسانے لکھ رہے ہیں۔ رپورتاژ لکھ رہے ہیں۔ کتابیں چھپوا رہے ہیں (گیارہ تصانیف تو چھپوا چکے ہیں)۔ یہ سب اپنے

www.taemeernews.com

اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ عاتق شاہ نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ غفلت سے پڑ جانے والی پہلی نظر جائز ہونے کے باوجود عورتوں کو گھورنے کا جواز نہیں پیدا کیا۔ لوگ حیرت کرتے ہیں کہ یہ کیسا ترقی پسند افسانہ نگار ہے؟ میرا خیال ہے کہ اگر ترقی پسند سارے کے سارے عاتق شاہ قسم کے ہوتے تو ترقی پسند تحریک کی نیک نامی میں اضافہ ہوتا۔

بعض اوقات عاتق شاہ کے پرانے ترقی پسند ساتھی، جن کے پاس حاضری دے دے کر عاتق شاہ نے اُن کی عادتیں بگاڑ رکھی ہیں مجھ سے یہ شکایت کرتے ہیں کہ "بھئی آج کل عاتق شاہ کیوں نہیں آرہا ہے؟" میں تو کچھ جواب نہیں دے پاتا۔ البتہ یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر کب تک آتا رہے گا عاتق شاہ؟ ــــ چالیس سال سے تو وہ مسلسل آرہا ہے۔ مزاج پرسی کر رہا ہے۔ عیادت کر رہا ہے۔ تسلی دے رہا ہے۔ دل بڑھا رہا ہے۔ حتیٰ کہ کسی شاعر یا ادیب کی موت پر جب اس کے دوست احباب جنازے میں شرکت کو فرضِ کفایہ جان کر انجان بن جاتے ہیں، وہ فرض عین جان کر شرکت کر رہا ہے۔ قبر پر پھول چڑھا رہا ہے۔ پسماندگان کو پُرسہ دے رہا ہے۔ آخر وہ کب تک یکطرفہ دوستی کا ثبوت دیتا رہے گا۔ دوستی اور محبت کا شعلہ تو دونوں طرف بھڑکنا چاہیئے۔ شعلہ نہ سہی، ڈھونگ ہی سہی، ڈرامہ ہی سہی۔!

یوں تو عاتق شاہ اردو کے لیکچرر ہیں۔ لیکن اُن کی ذات میں ایک فوجی چھپا بیٹھا ہے۔ اور یہ فوجی کب سے چھپا بیٹھا ہے اور کیوں چھپا بیٹھا ہے اور اس کی ٹریننگ اور تربیت پر عاتق شاہ نے کتنی رقم خرچ کی ہے؟۔ یہ ساری تفصیلات یقیناً عاتق شاہ کے کنفیڈینشیل ریکارڈ CONFIDENTIAL RECORD میں محفوظ ہوں گی۔ جبھی تو عاتق شاہ نے اس فوجی کو بہ دوش دیکر "فیلڈ مارشل"

www.taemeernews.com

کے عہدے سے نوازا ہے۔ یہ اُن کی خود شناسی نہیں، جوہر شناسی ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ پہلی ملاقات میں عاتق شاہ کسی پہلو سے بھی افسانہ نگار دکھائی نہیں دیتے۔ البتہ فیلڈ مارشل قسم کی مخلوق ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا اصرار بھی یہی ہوتا ہے کہ اُن کے ساتھی انھیں "فیلڈ مارشل" کے نام سے مخاطب کریں میں نے آج تک عاتق شاہ کو "فیلڈ مارشل" کے نام سے کبھی مخاطب نہیں کیا۔ لیکن آج اس بھری پُری محفل کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حضارِ محفل کے روبرو عاتق شاہ کو "فیلڈ مارشل" کہنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں اور ان کی ادبی کاوشوں اور کارناموں کو سیلوٹ کرتا ہوں۔ کیوں کہ یہی "فیلڈ مارشل" عاتق شاہ کی تصانیف اور افسانوں میں مجھے رواں دواں نظر آتا ہے۔!

۸۷

یہ خاکہ ممتاز افسانہ نگار عاتق شاہ کی گیارہویں تصنیف "دو منٹ کی خاموشی" کی رسمِ اجراء کے موقع پر پڑھا گیا۔

www.taemeernews.com

برق آشیانویؒ

کچھ یادیں، کچھ باتیں

سن یاد نہیں رہا۔ غالباً تیرہ، چودہ برس پہلے کی بات ہے۔ "علی کا ٹیج" میں سلیمان اریب مرحوم (ماہ نامہ "صبا" کے ایڈیٹر اور شاعر) کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میں ٹھیک وقت پر جلسہ گاہ میں موجود تھا۔ اور وقت پر پہنچنے کی اذیت سے گزر رہا تھا۔ شہر کے ادیب، شاعر و دانشور ایک ایک کر کے آنے لگے تھے۔ اِتنے میں برق آشیانوی صاحب تشریف لائے۔ ہال میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ کوئی مانوس یا منحوس (دگر جانا پہچانا) چہرہ نظر آجائے تو اس کے قریب بیٹھ سکیں۔ کوئی مانوس چہرہ تو انھیں نظر نہ آیا۔ البتہ جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی وہ میرے قریب آئے اور بازو کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہال میں مکمل طور پر تعزیتی فضا موجود تھی۔ ہال میں موجود لوگ علیک سلیک کا کام صرف اشاروں سے لے رہے تھے۔ برق صاحب کے بیٹھتے ہی ایک جانے پہچانے شاعر ہال میں داخل ہوئے۔ علیک سلیک کے لیے جیسے ہی دو چار ہاتھ اٹھے، برق صاحب نے مجھ سے پوچھا "یہ کون صاحب تھے"؟ میں نے ان کا نام بتایا۔ ان کے بعد شہر کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہال میں داخل ہوئی۔ برق صاحب نے پھر پوچھا "یہ کون صاحب ہیں"؟ میں نے ان کا نام بھی بتا دیا۔ پھر اس کے بعد تو میرا کام ہال میں داخل ہونے والے ہر شخص کا نام اور اس کے حدود اربعہ

www.taemeernews.com

بتانا رہ گیا تھا۔ لیکن جب روزنامہ "سیاست" کے جوائنٹ ایڈیٹر جناب محبوب حسین جگر داخل ہوئے تو... برق صاحب پھر وہی سوال دُہرایا کہ یہ کون صاحب ہیں" ؟

اب کی بار مجھ سے رہا نہ گیا۔ چنانچہ آہستہ سے کہا "برق صاحب! ابھی میں ان نام بتاتا ہوں۔ لیکن اسکے بعد آپ پلٹ کر مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ جناب آپ کون ہیں" ؟

برق صاحب لبوں پر برق لہرائی۔ اور پھر پوچھنے کا سلسلہ ترک کر دیا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ برق صاحب شہر کے کسی ادیب یا شاعر یا دانشور سے واقف نہیں تھے۔ واقف تو وہ سب سے تھے۔ لیکن ان کی واقفیت صرف تحریروں کی حد تک تھی۔ شخصی طور پر بہت کم لوگوں سے تعارف حاصل تھا۔ محفلوں میں بہت کم آیا جایا کرتے تھے۔ مگر چھپنے چھپاتے بہت تھے۔ لیکن چھپے رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ شاید ہی کوئی رسالہ یا اخبار بچا ہو جو ان کی تحریروں کی نعمت سے محروم رہا ہو۔ یہاں مجھے ان کی ایک تحریر یاد آ رہی ہے جو روزنامہ "رہنمائے دکن" کے ادبی صفحہ پر شائع ہوئی تھی جسے مصطفےٰ کمال نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مصطفےٰ کمال "رہنمائے دکن" کے ادبی صفحہ کو ترتیب دیا کرتے تھے۔ ان کو ایسی تحریریں شائع کرنے میں بڑا لطف آتا تھا جس میں ذرا "ڈِشم، ڈِشم" قسم کا مصالحہ ہو۔ برق صاحب کی تحریر کا عنوان تھا :

" ویمنس کالج کی طالبات اور بندر"

اتفاق سے اسی صفحہ پر میرا مضمون بھی شائع ہوا تھا۔ لیکن ذرا نیچے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ برق صاحب کی تحریر پر کالج کی طالبات نے بہت ہی واویلا مچایا

www.taemeernews.com

تھا۔ مضمون کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے :

"یہ معلوم کر کے ہمیں سخت حیرت ہوئی بلکہ شدید رنج پہنچا کہ ویمنس کالج کی طالبات بندروں سے پریشان اور خوف زدہ ہیں۔ رنج اس بات کا ہے کہ طالبات تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی پریشان ہو رہی ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بندروں کا انسانوں سے اس قدر قریبی رشتہ ہے کہ کسی اور جانور کا نہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی اور جانور کا انسان سے رشتہ ہی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بندر سے انسان کا جو رشتہ ہے وہ ڈارون کے نظریہ سے واضح ہے ۔ ۔ ۔ اگر کوئی جاہل انسان بندروں سے ڈرے یا گھبرائے تو پھر بھی قابل معافی ہے لیکن کسی تعلیم یافتہ شخص کا بندروں سے ڈرنا! ـــــ تعلیم یافتہ لوگوں کو بندروں سے ہرگز نہیں ڈرنا چاہیئے ۔ ۔ ۔" وغیرہ

آگے چل کر اسی مضمون میں برق صاحب نے طالبات کو چند مفید مشورے بھی دیئے تھے:

"۔ ۔ ۔ ۔ بندروں سے اس طرح پیش آئیں جس طرح "برخوردار" قسم کی مخلوق "بزرگ" قسم کی مخلوق سے پیش آتی ہے۔ یعنی یہ کہ ان کا ادب و احترام کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ادب و احترام میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ بس ذرا جھک کر سلام کر لیا کریں اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جائیں۔ رہا خاطر تواضع کا معاملہ۔ تو یہ بھی زیادہ مشکل نہیں ـــ طالبات اپنا ٹفن تو ساتھ لیجاتی ہوں گی ۔ ۔ ۔ طالبات کو چاہیئے کہ بندروں کی حرکات کو نظر انداز کر دیں۔ بچپن میں انسان بندر

www.taemeernews.com

سے بہت زیادہ مشابہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ
بچپن ہی سے انسان کٹھ جندری ہوتا ہے۔ ..." وغیرہ وغیرہ

برق صاحب کی تحریر تو آپ نے پڑھ لی۔ اب آپ ہی اندازہ لگائیے کہ تحریر کیا کہہ رہی ہے اور ان سطور میں کیا کہا جارہا ہے؟ لیکن طالبات نے اس کا بہت برا مانا اور شور مچانے لگے۔ مزاح نگاری میں یہی کچھ تو ہوتا آیا ہے۔ مزاح نگار کہتا کسی کو ہے اور آستینیں کوئی اور چڑھاتا ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاعر شعر بھی کہے اور مطلب بھی سمجھائے!

جب مزاح نگاری کا ذکر آ ہی گیا ہے تو کیوں نہ میں برق صاحب کی مزاح نگاری کا بھی ذکر کروں۔ برق صاحب نے اپنی پہلی کتاب کے تعارف میں لکھا ہے کہ مزاح نگاری کے لیے چار عناصر ضروری ہیں:

ایک زبان، دوسرے زندگی کی عکاسی، تیسرے، قوتِ مشاہدہ۔ چوتھے، نفسیاتی تجزیہ۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ مزاح وہ ہے جو قاری کے لبوں پر تبسم بکھیر دے۔ (چنانچہ اسی مناسبت سے انھوں نے اپنی پہلی کتاب کا نام "...... یہ ایک تبسم" ہی رکھا تھا۔

برق صاحب کی مزاح نگاری کی بنیاد انھیں چار عناصر پر قائم ہے۔ مجھے تو برق صاحب کے مشاہدہ پر حیرت ہوتی ہے۔ اگر آپ ان کے مضامین پڑھیں تو پتہ چلے گا کہ برق صاحب کا مشاہدہ کتنا تیز تھا۔ حالانکہ وہ ان مزاح نگاروں میں نہیں تھے جو محض مشاہدہ اور تجربہ کی خاطر بے اعتدالی کی زندگی گزارتے ہیں۔ ان کا شمار ایسے ادیبوں اور شاعروں میں بھی نہیں کیا جا سکتا جو "مقامات آہ و فغاں" پر اکثر و بیشتر نظر آتے اور لڑکھڑاتے ہیں۔ وہ ایک نہایت ہی شریف، نیک نفس اور

www.taemeernews.com

منکسرالمزاج انسان تھے۔ ان کی ذات کے اطراف شرافت، وضع داری، سنجیدگی، متانت و بردباری کا ایک حصار کھنچا ہوا رہتا تھا۔ وہ اس بات کا موقع ہی نہیں دیتے تھے کہ کوئی ادیب یا شاعر اس حصار کو توڑے۔ اور وہ خود بھی اس حصار سے باہر آنا پسند نہیں کرتے تھے۔

ان سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اپنی عمر کی نصف سنچری پار کر چکے تھے۔ سر اور پیشانی کی حدِ فاصل اڑ کر سر کے اس حصّے میں جا چکی تھی جہاں سے دماغ کی عملداری شروع ہوتی ہے۔ سُرخ و سپید رنگت جب کسی سے ملاقات کرتے تو چہرے پر مسکراہٹ دوڑ جاتی تھی۔ اور پھر چہرے کی سپیدی پر سُرخی غالب آ جاتی تھی۔ ستواں ناک جس پر لیڈی کٹ عینک بڑی بھلی لگتی تھی۔ چہرہ پر مختصر سی فرنچ کٹ داڑھی۔ جس کی قطع و برید میں سلیقہ مندی کو دخل تھا لیکن گوشہ نشینی کے بعد داڑھی کو مزید بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ داڑھی بالکل شرعی حدود میں آ گئی تھی۔ آخری دِنوں میں سر کے بالوں کی جگہ سفید پگڑی نے لے لی تھی۔ سفید داڑھی اور سفید پگڑی — سراپا بالکل مولانا برق آشیانوی بن گئے تھے۔ قد واجبی واجبی سا پایا تھا۔ ٹھنگنوں کھڑے ہوتے تو اوسط قد کے معلوم ہوتے تھے۔ چونکہ اکہرے بدن کے تھے اور گوشت پوست سے لدے پھندے نہیں تھے، اس لیے "ٹھنگنا" یا "پست قد" کی تہمت سے بری تھے۔ ہمیشہ شیروانی اور ڈھیلے ڈھالے پاجامہ میں ڈھلے رہتے تھے۔ شاعر بھی تھے لیکن نفاست پسندی کا بڑا خیال رکھتے تھے۔

وہ ایک عرصے تک زندہ دلان حیدرآباد کے جوائنٹ سکریٹری رہے۔ زندہ دلان کی میٹنگوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ مجھے کوئی ایسی

www.taemeernews.com

میٹنگ یاد نہیں جس میں برق صاحب نے اختلاف رائے کیا ہو۔ ہمارے برق آشیانوی ایک ایسی برق کے مماثل تھے جس نے انسانوں سے شریفانہ معاہدہ کر رکھا ہو۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ برق گرم ہوتی ہے یا ٹھنڈی۔ میں نے کبھی اپنے اوپر برق کو گروا کر کوئی تجربہ نہیں کیا۔ البتہ زندہ دلان حیدرآباد کے جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے مجھے برق صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ یہی نہیں، ان کے ساتھ ریل کا ایک سفر تو یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ دسمبر ۱۹۷۴ء میں بھوپال میں ایک کل ہند مزاحیہ کانفرنس منعقد کی گئی تھی، جس کے پیچھے میرے مزاح نگار دوست مجتبیٰ حسین کا ہاتھ تھا۔ مزاحیہ کانفرنس مجتبیٰ حسین کی کمزوری ہیں۔ اور میری کمزوری مجتبیٰ حسین ہیں۔ چنانچہ دہلی سے مجتبیٰ حسین نے تخلص بھوپالی کو لکھا کہ حیدرآباد کے مزاح نگاروں کو بھوپال لانے کی ذمہ داری مسیح انجم پر ڈال دیں۔ اس طرح یہ ذمہ داری بالواسطہ طور پر مجھ پر آپڑی تھی۔ ادیبوں کو جمع کرنا تو آسان کام ہے۔ لیکن شاعروں کو جمع کرنا، اللہ کی پناہ! ایک کو منا کر لانے تک دوسرا چھدک کر نکل جاتا ہے۔ دوسرے کو گھیر کر لانے تک تیسرا چھدک کر چل دیتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے گرد بڑ حیدرآبادی، مصطفیٰ علی بیگ، طالب خوندمیری اور لوگس حیدرآبادی کو راضی کیا۔ سوچ رہا تھا کہ برق صاحب کو کس طرح راضی کروں؟ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ وہ ریل کے لمبے سفر سے گھبراتے ہیں لیکن جب میں نے اُن سے درخواست کی تو کچھ عذر کیا نہ حیلہ — فوراً رضامندی دے دی یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی۔ حالانکہ ایک تو "شاعر" اور دوسرے "ریل کا لمبا سفر" ہونے کے ناتے ان کو عذر اور حیلے کا ڈبل چانس تھا۔ اس سفر میں برق صاحب جو توشہ لائے تھے وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ (مراد توشہ دان سے نہیں) مطلب یہ کہ بیک وقت تین چار آدمی سیر ہو کر کھا سکتے تھے۔ اور ڈشیں بھی ایسی کہ بس

www.taemeernews.com

انگلیاں چاٹتے رہ جائیے۔ مرحوم میں خاص وصف یہ تھا کہ وہ کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ اس سفر میں برقؔ صاحب نے کھایا کم اور کھلایا بہت۔ سفر سے واپس ہوئے تو بہت خوش تھے۔ بھوپال کے کل ہند مزاحیہ مشاعرے میں انھیں بے پناہ داد ملی تھی۔ اس قطعہ پر تو ہال کی چھت قہقہوں سے اُڑتے اُڑتے رہ گئی تھی:

سیکس ایجوکیشن شریک درس ہونا چاہیئے
لیکن اس میں احتیاط اس بات کی فرمائیے
جس قدر تعلیم ہو اسکول ہی میں دیجیئے
"ہوم ورک" اس کا مگر بچوں سے مت کروائیے

ان سے آخری ملاقات آج سے تقریباً دس بارہ مہینے پہلے ہوئی جبکہ کراچی (پاکستان) سے پروفیسر حمید الدین شاہد حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ برقؔ صاحب نے شاہد صاحب کے اعزاز میں اپنے گھر پر ایک مخصوص ادبی نشست کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ اور طالب خوندمیری مدعو تھے۔ مجھے اس محفل میں مزاحیہ مضمون سنانا تھا۔ اس محفل میں جب برقؔ صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر نقاہت کے آثار نمایاں تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی لمبے سفر کے بعد تھک سے گئے ہیں۔ پچھلے کئی سال سے تو وہ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ بالکل تارک الدنیا ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود ادب سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا تھا۔ جب کبھی مخلص سر اُبھارتا کوئی نہ کوئی چیز نظم یا مضمون کی شکل میں "شگوفہ" کو بھیج دیتے تھے۔ یہ ان کا خیریت نامہ بھی ہوتا تھا اور تبسم بھی۔ اس طرح برقؔ صاحب نے آخر وقت تک "شگوفہ" کے توسط سے مزاح اور مسکراہٹ سے اپنا تعلق برابر برقرار رکھا لیکن ان کا یہ تعلق ۱۲ اگست ۱۹۸۲ء کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ٹوٹ گیا۔ اور وہ برقؔ آشیانی سے خلد آشیانی ہو گئے!۔

www.taemeernews.com

شاعر ایک، نام تین

رشید + سمیع + جلیل

آج سے کوئی اٹھارہ اُنیس سال پہلے، مَیں رشید عبدالسمیع جلیلؔ کو پہلی بار اے جی آفس کے ایک مشاعرے میں دیکھا تھا جس کی صدارت مخدوم صاحب فرما رہے تھے۔ شہر کا ایک سے ایک خرانٹ قِسم کا شاعر اس مشاعرے میں موجود تھا۔ مَیں اپنی دانست میں سمیع کو ایک سامع سمجھ بیٹھا تھا کیوں کہ اس کے چہرے سے نہ تو وحشت برس رہی تھی اور نہ بدحواسی ہویدا تھی جو عموماً شاعروں کی ذات سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کا لباس نہایت ہی معقول قسم کا تھا جو اس کی شخصیت سے پوری طرح میل کھاتا تھا۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی جو دور سے تو قطعی نظر نہ آتی تھی۔ البتہ قریب سے دیکھنے پر کچھ کچھ دکھائی دیتی تھی۔ بالفاظِ دیگر وہ داڑھی نہیں ایک موہوم سی امید تھی جو ٹھوڑی کے کنارے کے ساتھ ساتھ ایک پتلی سی نحنی لکیر بناتی چلی گئی تھی۔ اس قسم کی تراش وخراش اور وضع وقطع میں نائی کی ہنرمندی کو دخل تھا یا سمیع کی حکمتِ عملی کو، یہ راز صاحبِ داڑھی جانے، مَیں کیا جانوں! اُس مشاعرے میں رشید عبدالسمیع، المتخلص بہ جلیلؔ نے کیا کارِ ہائے نمایاں تے کیا سُنایا تھا، کچھ یاد نہیں رہا۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ جلیلؔ نے اپنی غزل کے ایک شعر میں مقتل کو زبردست چیلنج کیا تھا اور مارنے مرنے کی دھمکی تھی۔ پتہ نہیں، جلیلؔ نے وہ شعر ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر کہا تھا یا صدرِ مشاعرہ کو خوش کرنے کے لیے۔ خواہ کچھ ہو، جلیلؔ کے لہجے

www.taemeernews.com

سے لینن کا پیغام صاف سنائی دے رہا تھا۔ چونکہ بات ترقی پسندی کی تھی اور صدارت مخدوم کی، اس لیے داد کا ملنا یقینی تھا۔ یوں بھی مخدوم نوجوانوں کا حوصلہ بڑھانے میں بڑی فراخدلی سے کام لیا کرتے تھے۔ چنانچہ صدر مشاعرہ نے اس شعر پر بے پناہ داد دی، جس کے جواب میں رسیدی طور پر جلیل نے ایک اناڑی اور اَن ٹرینڈ (UNTRAINED) دُلہا کی طرح دھڑا دھڑ دو چار اُلٹے سیدھے آداب بھی بجا لائے جلیل کا وہ غالباً پہلا مشاعرہ تھا۔

اب، جب میں اٹھارہ، انیس سال پہلے کے جلیل کا آج کے جلیل سے تقابل کرتا ہوں تو اسے انتہائی حواس باختہ پاتا ہوں۔ چوالیس سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے؟ اس عمر میں تو بعض زندہ دل عقدِ ثانی کی سوچتے ہیں۔ اور پرویز یداللہ مہدی جیسے تو کر کے بھی دکھاتے ہیں۔ ویسے، کبھی کبھی جلیل بھی دبے دبے انداز میں اس کا اظہار کر دیتا ہے۔ دلیل کے طور پر ایک چھوٹا سا واقعہ پیش ہے۔ ایک بار اس کے گھر والوں کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کر ایک ترکاری والی اس کے تین سالہ چھوٹے لڑکے کو اُٹھا لے گئی۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ لیکن جب کافی دیر تک بچہ نظر نہ آیا تو اس کے گھر والوں نے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ بڑی جستجو کے بعد وہ موقع واردات پر پہنچ ہی گئے جہاں ایک عورت، ترکاری والی سے بچے کا سودا کر رہی تھی۔ کافی بحث و مباحث کے بعد جلیل کے گھر کے افراد اپنے بچے کو چھڑا کر لانے میں کامیاب ہو گئے۔

دوسرے دن جب میں نے اس واقعہ کے حوالے سے جلیل کو چھیڑا تو وہ ہنس کر بولا: "کہاں ہے اُس عورت کا مکان جسے بچے کی ضرورت ہے؟ میں اس سے ایک بار مِل لینا چاہتا ہوں"!

ہاں تو میں جلیل کے حواس کی بات کر رہا تھا۔ اس کے حواس خمسہ میں کی ایک

www.taemeernews.com

جس اب اسے ہانتھ دینے لگی ہے۔ دُور کی بصارت بہت ہی کمزور ہوگئی ہے۔ پتہ نہیں کب، کس عورت سے ہٹ جائے! البتہ بصیرت تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ لیکن اس کو یہ جان لینا چاہیے کہ زر پرستی، خود غرضی اور مفاد پرستی کے اس دور میں وہ اپنی بصیرت کو لے کر کیا کرے گا جس کے کوئی دام ہی نہیں، جب کہ بصارت بیچنے پر منہ مانگے دام مل جاتے ہیں۔ اس کا رنگ جلنے کی طرف مائل ہے لیکن جیسے جیسے اس کا رنگ جلتا جارہا ہے اس کا فن جلا پا رہا ہے اور شاعری نکھرتی جارہی ہے۔ چنانچہ اس کی ایسی ہی مدتوق حالت کو دیکھ کر کچھ عرصہ پہلے میرے ایک ستم ظریف خالہ زاد بھائی نے جلیل کے غیاب میں یہ ریمارک کیا تھا "ارے یہ کیسا شاعر ہے بھئی بالکل ڈکل معلوم ہوتا ہے!" "ڈکل" ایک بول چال کا لفظ ہے جو صرف دیہات میں بولا جاتا ہے۔ آپ نے سیندھی کا درخت تو دیکھا ہی ہوگا۔ اور آپ کو یہ بات بھی معلوم ہی ہوگی کہ اس درخت سے سیندھی نکالی جاتی ہے۔ سیندھی کے درخت سے بوند بوند سیندھی حاصل کرنے کے لیے تانسندہ (یعنی کلال) اس درخت کو تاستا چلا جاتا ہے۔ تاسنے کے اس عمل کے دوران کبھی کبھار ایک ایسی منزل بھی آجاتی ہے جب کہ سیندھی کا درخت تاسے ہوئے حصے کی دوسری جانب کچھ اس طرح جھک جاتا ہے جیسے حروف تہجی میں "م" (میم) درخت کے اس منزل پر پہنچنے کے بعد جو سیندھی حاصل ہوتی ہے اُس میں وہ FORCE اور POWER نہیں ہوتا جس کے لیے سیندھی مشہور ہے ایسی منزل کو پہنچائے گئے سیندھی کے درخت کو "ڈکل" کہتے ہیں۔ اب آپ اس وضاحت کی روشنی میں جلیل کے لنز یہ دنزاحیہ شعری مجموعے "ہنی دانم" میں کے "م" (میم) کو دیکھیے اور استادہ حالت میں

www.taemeernews.com

رشید عبدالسمیع جلیل کو بھی ملاحظہ فرمائیے تو پتہ چلے گا کہ دلوان اور صاحبِ دلوان میں کتنی مماثلت ہے۔ سینڈھی کے درخت کو کلال اپنے ذاتی مفاد کے لیے تاستا اور زخم پہنچاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جلیل کو زمانہ بھی ایک کلال کے روپ میں مسلسل تاستا اور خون چوستا جارہا ہے۔ کبھی بیوروکریسی کے روپ میں تو کبھی دفتر کے باس کے روپ میں۔ کبھی گرانی بن کر تو کبھی قرض خواہ بن کر۔ لیکن اس کے باوجود جلیل کی اعلیٰ ظرفی کا یہ عالم ہے کہ وہ بوند بوند خون دیتا ہوا بھی جی رہا ہے مسکرا رہا ہے، سگریٹ پی رہا ہے، کھانس رہا ہے، قہقہے لگا رہا ہے، شعر موزوں کر رہا ہے۔

مختصر یہ کہ جلیل زندگی کے زہر کو "زہر قند / زہر خند" میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ بھلے ہی "ڈکل" سہی، لیکن اس کی شاعری "ڈکل" نہیں ہے، اور اس کا شعری مجموعہ "نمی دانم" طنز و مزاح کا ایک حسین امتزاج ہے

صحت کے معاملے میں وہ انتہائی لاپرواہ واقع ہوا ہے۔ سگریٹ اس کثرت سے پیتا ہے کہ اس کی انگلیاں تک پیلی پڑ گئی ہیں۔ پھیپھڑوں کی حالت اللہ ہی جانے۔ ویسے سگریٹ میں بھی پیتا ہوں۔ طالب خوندمیری بھی پیتے ہیں، بلکہ دوستوں کو آفر بھی کرتے ہیں۔ سگریٹ تو ڈاکٹر مصطفیٰ کمال بھی پیتے ہیں، اور وہ بھی فارن برانڈ۔ صبح ایک تو شام ایک، ان کی سگریٹ نوشی تو محض ایک تفریح ہے۔ ان کا اصل مقصد تو اپنے چند بے تکلف دوستوں جیسے مظفر مجاز، غیاث متین اور بطور خاص راقم الحروف کو سگریٹ دکھا دکھا کر ترسانا اور تڑپانا ہوتا ہے لیکن جہاں تک جلیل کی سگریٹ نوشی کا تعلق ہے، وہ اس معاملے میں MAXIMUM BENEFIT کا قائل ہے۔ اور قائل بھی اس حد تک کہ ایش ٹرے کے استعمال کی بہت ہی کم نوبت آتی ہے۔ سالم سگریٹ پی جاتا ہے۔

www.taemeernews.com

سگریٹ پیا جاتا ہے اور کھانسا بھی جاتا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں سگریٹ نہ ہو تو اس کی انگلیاں بلبل ترنگ بجانے کے انداز میں حرکت کرتی رہتی ہیں۔ میں بھلا کون ہوتا ہوں جو اس کے کھانسنے اور خیالی بلبل ترنگ بجانے پر اعتراض کروں۔ البتہ مجھے اس وقت بڑا عجیب سا لگتا ہے جب وہ نماز کے بعد دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتا ہے تو اس کی ابتداء کھانسی سے ہوتی ہے۔ وہ اس کی دُعا نہیں بلکہ "کھانسی نامہ" ہوتی ہے۔ اگر کوئی غیر مُسلم اس کو اس پوزیشن میں دیکھ لے تو شائد یہ گمان کر بیٹھے کہ مسلمانوں کے یہاں دُعا کے ساتھ ساتھ کھانسنا بھی لازمی ہے۔ مجھے اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہے کہ اس خاکے میں سگریٹ اور دھواں بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ سگریٹ اور چائے کے ذکر کے بغیر جلیل کا خاکہ مکمل ہی نہیں ہو پاتا۔ اگر میں یہ کہوں تو شائد غلط نہ ہو گا کہ جلیل صرف چائے اور سگریٹ پہ زندہ ہے۔ اگر میرے عزیز دوست طالب خوندمیری اپنی کسی پینٹنگ میں چائے کی پیالی، سگریٹ اور دھویں کو پینٹ کر کے مجھ سے عنوان تجویز کرنے کے لیے کہہ دیں تو میں بلا جھجک یہی کہوں گا کہ یہ تو رشید عبدالسمیع جلیل ہے۔ جلیل اگر سگریٹ نوشی ترک کر دے تو اس کے آدھے سے زیادہ مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اور صحت خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن اس کے ذہن میں یہ بات بُری طرح بیٹھی ہوئی ہے کہ وہ اگر سگریٹ نوشی ترک کر دے گا تو اس کی تخلیقی صلاحیت سلب کر لی جائے گی۔

جلیل بڑا لیٹ لطیف ہے۔ اُس سے وقت کی پابندی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اُس وقت آفس پہنچتا ہے جب کہ لنچ کے لیے ایک آدھ گھنٹہ باقی رہتا ہے۔ وقت کی پابندی کے معاملے میں اس کا کوئی بھی افسر اسے راہ راست پر نہ لا سکا، بلکہ وہ خود راہ راست پر آ گئے۔ جلیل ایک ایسا کلرک ہے جو "دیر آید، درست آید" کے مقولے کو منوا کر یا وہ

www.taemeernews.com

اُن کلرکوں میں شامل نہیں جو دفتر کو تو وقت پر آتے ہیں مگر کام کو جوں کا توں پنڈنگ رکھتے ہیں۔ کاش کہ جلیل وقت کی پابندی کے بل بوتے پر کام کو پنڈنگ رکھنے کا ہُنر جانتا۔

اس کی شام رات کے بارہ بجے سے شروع ہوتی ہے۔ وہ کبھی غفلت سے سرِ شام اپنے گھر پہنچ جاتا ہے تو اس کی بیوی اور بچے پریشان ہو کر اس کی مزاج پرسی میں لگ جاتے ہیں۔ دن چڑھے تک سوتے رہنا اس کی عادت ہے۔ چاہے دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے وہ دس بجے سے پہلے اٹھنا جانتا ہی نہیں۔ لیکن اس دَوران میں "تیرے خیال سے غافل نہیں رہا" کے مصداق فجر کی نماز ضرور پڑھ لیتا ہے، چاہے قضا ہی کیوں نہ ہو! البتہ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس وقت کون سی نماز کی نیت باندھتا ہے۔

وہ میرا دوست تو ہے ہی، لیکن اب پڑوسی بھی بن گیا ہے۔ جب سے وہ میرا پڑوسی بنا ہے مَیں اس کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش میں، اس کی جانب کھنچا جا رہا ہوں۔ جلیل ایک انتہائی شریف النفس، مخلص، خوش گفتار اور ظریف الطبع انسان کا نام ہے مَیں نے کہیں ایک ماہرِ نفسیات کا یہ قول پڑھا تھا کہ جو شخص جینیس (GENIUS) ہوتا ہے اس کی ذات میں بلا کی لااُبالی اور بے اعتدالی رچی بسی ہوتی ہے۔ پتہ نہیں اس قول میں کس حد تک صداقت ہے۔ بہرحال، اس قول میں صداقت ہو یا نہ ہو مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ جلیل ڈھکّل بلاشبہ جینیس (GENIUS) ہے۔

رشید عبدالسمیع جلیل سنجیدہ شاعری بھی کرتا ہے اور مزاحیہ شاعری بھی۔ اس کی سنجیدہ شاعری کا ایک مجموعہ "نصابِ دل" کے نام سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ لیکن وہ سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری میں صرف ایک ہی تخلص "جلیل" سے کام

www.taemeernews.com

چلا لیتا ہے۔ ایسی کفایت شعاری بھی کس کام کی؟ میرا یہ خیال ہے کہ اس کو دو تخلصوں سے کام لینا چاہیئے۔ سنجیدہ شاعری میں جلیل، اور مزاحیہ شاعری میں "ڈکل"۔ اس طرح "جلیل ڈکل" کی مناسبت سے اس کے فن شعر گوئی کو سمجھنے میں نقادوں کو بہت زیادہ مدد ملے گی۔

نوٹ:۔ یہ مضمون ممتاز شاعر رشید عبدالسمیع جلیل کے طنزیہ و شعری مجموعے "می دانم" کی رسم اجراء کے موقع پر پڑھا گیا!

■■

TURFA TAMASHA
(HUMOUROUS ESSAYS & FANTASIES)
BY : MASEEH ANJUM, B.A., B.Ed.